

نے جیسے دیوار سے کان لگا دیے۔  
 ”کون ڈاکٹر شیرازی؟“ بھیا پوچھ رہے تھے۔  
 ”تم شاید نہیں جانتے“ اماں سوچتے ہوئے بولیں۔  
 پھر اُن کی آواز اور دھیمی ہو گئی۔ وہ شاید آبا اور  
 بھیا کو ڈاکٹر شیرازی کے بارے میں بتا رہی تھیں اور آسیہ  
 کو اُن کے بارے میں جاننے کی ضرورت نہیں تھی، پھر  
 بھی وہ یہ ضرور جاننا چاہتی تھیں کہ اُن کی والدہ کیوں  
 آئی تھیں اور اس وقت نووہ باوجود کوشش کے  
 اماں کی باتیں نہیں سن سکیں، لیکن صبح کو آبا اور بھیا  
 کے جانے کے بعد ہی وہ اماں کے پاس آ بیٹھیں۔  
 ”اماں! کل ڈاکٹر شیرازی کی والدہ کس وقت

اپنے تئیں اماں، آبا اور بھیا اپنی آوازیں دبا  
 کر بات کر رہے تھے، لیکن ساتھ والے کمرے میں بیٹھی  
 آسیہ بی بخوبی سن رہی تھیں پہلے انہوں نے زیادہ توجہ  
 نہیں دی کیونکہ وہی پُرانی باتیں تھیں اور مایوسی بنا آمیری  
 اور نہ جانے کیا کچھ۔ پھر اچانک اماں نے نا اُمیدگی کے  
 اندھیروں میں جیسے اُمید کی کرن جلادی۔  
 ”آج ڈاکٹر شیرازی کی والدہ آئی تھیں۔“ پتا نہیں یہ  
 بات اماں کے ہونٹوں سے نکلی تھی یا اُن کے اندر کی  
 خواہش جو حسرت بن گئی تھی، پھر سے بیدار ہو کر ان کی  
 سماعتوں کو دھوکا دے گئی تھی۔ بہر حال سنی کو تھپکتا  
 اُن کا ہاتھ وہیں ٹھہر گیا اور سانس روک کر انہوں

نگہتہ عید اللہ

کھٹکے ملے  
 کھٹکے ملے کھٹکے  
 کھٹکے ملے کھٹکے





آئی تھیں؟

”ان کے پوچھنے پر اماں چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ شاید انہیں اُمید نہیں تھی کہ آسیہ بی بی لوں بلا جھک ڈاکٹر شیرازی کے بارے میں بات کرنے لگیں گی۔“

”بتائیں ناں اماں! آسیہ بی بی نے اصرار سے پوچھا۔ تب انہیں احساس ہوا کہ یہ پانچ سال پہلے والی آسیہ نہیں ہے۔ جب ڈاکٹر شیرازی کے بارے میں بتاتے ہوئے جیسا سے ان کی گردن اس قدر جھک گئی تھی کہ پھر مہینوں وہ اماں کے سامنے پلکیں تک نہ اٹھا سکی تھیں۔ اب بھی ان کے انداز میں بے باکی نہیں تھی بلکہ بیٹے کی ماں ہونے کا ستھوڑا سا زعم۔ اماں سمجھ گئیں اب ان کے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے پہلے ان کی مرضی معلوم کرنی ضروری ہوگی۔ پھر بھی ٹالنے کی غرض سے بولیں۔“

”غالباً تم اُس وقت پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔“  
”کیوں آئی تھیں؟“  
”تہا بے لیے۔“

”میرے لیے۔“ اپنی طرف اشارہ کر کے آسیہ بی بی سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھیں۔  
”ہاں، شیرازی کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔“  
”اماں نے بول کہا، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جبکہ آسیہ بی بی سنائے میں آگئیں۔“

”اب۔۔۔ اب اماں جب تقدیر نے میرے سر پر بیوگی کی چادر اٹھادی، میری گود میں بچہ۔۔۔“  
”یہ سب مقدروں کے کھیل ہیں بیٹا! شاید اُوپر والے کو اسی طرح منظور تھا۔ اماں گہری سانس لے کر بولیں۔“

”لیکن آپ نے ان سے پوچھا نہیں کہ جس چوکھٹ بے آنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں، اس پر اب کیسے جلی آئیں؟“  
”بیٹا! اماں کتنی دیر ان کی طرف دیکھتی رہیں پھر بے بسی سے بولیں۔“

”تم نہاں نہیں ہو میری جان! خود سوچو کہ تہا بے سر پر رکھی سفید چادر یہ ساری باتیں پوچھنے کی اجازت دیتی

ہے۔ ہاں اگر تہا بے ساتھ یہ۔۔۔ نہ ہوتا۔ تب پانچ تو کیا دس برس بعد بھی وہ آتیں تو میں ان سے ضرور پوچھتی، لیکن اب میں مجبور ہوں تہا بے لیے آیا ہوا کوئی بھی پیغام محض اس لیے مسترد نہیں کر سکتی کہ انہوں نے پہلے تہا بے لیے دامن کیوں نہیں پھیلایا تھا۔ اب تو ہمیں آنے والے کی شرافت کا یقین کرنا ہے اور بس۔“

”میں اور سنی آپ پر بو جھپٹیں اماں؟“ آسیہ بی بی رد ہانسی ہو گئیں۔

”نہیں بیٹا! بو جھ کیوں ہونے لگے۔“  
”پھر آپ میری دوبارہ شادی کا خیال چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“

”کیسے چھوڑ دوں، کوئی اتنی عمر تو نہیں ہے تہا ری۔ ہمارا کیا بھروسہ آج ہیں، کل نہیں، پھر آگے پہاڑی زندگی کس کے سہارے گزارو گی؟“

”سنی ہے ناں! آسیہ بی بی کے بچے میں مامتا کے ساتھ وہ زعم بھی سمٹ آیا جو ایک عورت بیٹے کو جنم دیتے ہی حاصل کر لیتی ہے۔“

”سنی سال بھر کا بچہ اسے خود نہ صرف تہا را بلکہ باپ کا سہارا بھی چاہیے۔“

”باپ کا؟“ آسیہ بی بی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔  
”کیا کوئی میرے بچے کو پدرانہ شفقت دے سکتا ہے؟“  
”کیوں نہیں، اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ اقد میں سمجھتی ہوں، جو خود اولاد والا ہوگا، اسے تہا ری اولاد کا احساں بھی ضرور ہوگا۔“

”کیا ڈاکٹر شیرازی۔۔۔؟“ آسیہ بی بی پرسوج انداز میں اسی قدر کہہ سکیں۔

”ہاں، ایک بیٹی ہے ان کی چار سال کی۔ اماں وہی بتانے لگیں جو ڈاکٹر شیرازی کی والدہ انہیں بتا کر گئی تھیں۔“  
”ان کی بیوی گزشتہ سال الٹھ کو پیاری ہو گئیں۔ وہ دوبارہ شادی پر رضامند نہیں تھے، لیکن جب ان کی والدہ نے تہا را نام لیا تو خاموش ہو رہے۔“

”آپ نے انہیں بتلایا ہے ناں کہ میں اب ایک بچے کی ماں ہوں؟“

”ظاہر ہے، یہ کوئی چھپانے والی بات ہے، بلکہ میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ اگر شیرازی بچے کے ساتھ تمہیں قبول کرتے ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ



دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ کریں؟ اماں کی بات  
 آئیہ بی کو قد سے اطمینان ہوا۔  
 شاید قسمت میں آئیہ بی اور ڈاکٹر شیرازی کا ملن  
 اسی طرح نکھاتا تھا کہ پہلے دونوں الگ الگ راستوں  
 کے مسافر ہوئے، پھر جب منزل ایک ہوئی تو دونوں  
 کے دامن میں مسافرت کے نشان موجود تھے۔  
 آئیہ کی گود میں سال بھر کا سنی اور شیرازی کے دست  
 شفقت تلے چار سالہ قرعہ تھی۔ گوکہ بہت زیادہ عرصہ  
 نہیں گزرا تھا۔ بس پانچ سال پہلے کی ہی بات تھی، پھر  
 بھی آئیہ بی کو ڈھنگ سے یاد نہیں تھا کہ ڈاکٹر شیرازی  
 سے ان کی ملاقات کب، کہاں اور کن حالات میں ہوئی  
 تھی۔ البتہ یہ اچھی طرح یاد تھا کہ وہ پہلی بار سامنا ہونے  
 پر ہی آئندہ کی بات کرنے لگے تھے۔ پہلے کچھ جھجک  
 کر اور گھما پھر کر اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا، پھر ایک دم  
 صاف لفظوں میں کہہ گئے تھے۔

”میں آپ سے دوبارہ بلکہ بار بار ملنے کا متنی ہوں۔“  
 ان کی شخصیت میں جانے کیا سحر تھا کہ آئیہ بی  
 نہ نہ کرتے بھی ہاں کر گئی تھیں۔ پھر بس چند ماہ ہی دونوں  
 عبتوں کی حسین رہ گزریں ہمیشہ ساتھ چلنے کی باتیں کرنے لگے  
 تھے کہ دوریاں مقدہ ہو گئیں۔ آئیہ بی کے لیے راشد خان  
 کا پروپوزل آیا، تو انہوں نے پریشان ہو کر ڈاکٹر شیرازی  
 کو بتایا اور ڈاکٹر شیرازی نے اسی روز گھر میں اپنی  
 والدہ سے آئیہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی اس خواہش  
 کا اظہار بھی کیا کہ وہ آئیہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔  
 ان کی والدہ کو یوں تو کوئی اعتراض نہیں ہوا لیکن  
 جب یہ معلوم ہوا کہ آئیہ بی متوسط طبقے کے بہت  
 عام سے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں، تو انہوں نے  
 اس چوکھٹ پر جانے سے صاف انکار کر دیا اور شیرازی  
 جنہوں نے کبھی والدہ کے سامنے سر اودھنا کے بات  
 نہیں کی تھی، ان کے صاف انکار پر اگر خاموش نہیں  
 رہ سکتے تھے، تو انہیں قائل بھی نہیں کر سکے تھے پھر  
 یہ ان کی شرافت یا سادگی ہی تھی کہ انہوں نے آئیہ  
 کو کسی آسے میں رکھنے کے بجائے صاف لفظوں میں  
 معذرت کرتے ہوئے کہہ دیا تھا۔  
 ”مجھے افسوس ہے آئیہ! میں اتنی جان کو قائل نہیں

کر سکا۔ میں تمہیں انتظار کرنے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتا  
 کیونکہ میں جانتا ہوں کہ دس برس بعد بھی تمہارا نام یوں  
 گا، تو اتنی انکار ہی کریں گی اور میں اگر ان کی مرضی کے  
 خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت رکھتا بھی نہیں تب  
 بھی مجھے معاف کرنا کہ میں اپنی ماں کو ناراض نہیں  
 کر سکتا۔“

اور آئیہ بی نے یوں ہمک آنے سے پہلے ہی  
 سارے شکوؤں کا گلا گھونٹ دیا تھا کیونکہ وہ مکافات  
 عمل پر یقین رکھتی تھیں۔ جانتی تھیں کہ اگر آج وہ ایک  
 بیٹے کو ماں کے خلاف کھڑا کریں گی تو کل خود ان کے  
 ساتھ ایسا ہو سکتا ہے۔

یوں جس خاموشی سے دونوں ایک دوسرے کی  
 زندگی میں آئے تھے، اسی خاموشی سے نکل گئے تھے۔  
 یہ نہیں تھا کہ دل رویا نہیں، پھلا نہیں، یہ سارے سانچے  
 دل پر گزرمے، لیکن دل کو سمجھانا ناممکن بھی نہیں تھا۔

یوں آئیہ بی نے جو راشد خان کے پروپوزل پر پریشان  
 ہو کر اماں کو شیرازی کے بارے میں بتا کر انتظار  
 کرنے کو کہا تھا، ایک بار پھر اسی طرح سر جھکائے  
 ہوئے بولی تھیں۔

”اماں! ڈاکٹر شیرازی کا انتظار فضول ہے۔ آپ  
 چاہیں تو راشد کے گھر والوں کو ہاں کہہ دیں۔“  
 پھر راشد خان کے سنگد خست ہو کر آئیہ بی  
 وہ شہر ہی چھوڑ گئیں۔ سال میں ایک آدھ بار راشد  
 کو چند دن کی چھٹی ملتی، تو وہ اپنے ساتھ ہی انہیں اہل  
 ابا سے ملانے لے آتے تھے۔  
 زندگی میں اگر مکمل طور پر طمانیت نہیں تھی تو کوئی اتنی  
 بے اطمینانی بھی نہیں تھی۔ گھر داری میں مصروف رہ کر وہ کافی  
 کچھ فراموش کر چکی تھیں۔

شادی کے چوتھے سال اللہ میاں نے جہاں انہیں  
 ایک بیٹے سے نوازا، وہاں چند دن بعد سائبیل چچین  
 یا آئیہ بی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ برسوں بعد  
 سونی گود بھر جانے کی خوش متائیں یا سرنگاہو جانے  
 کا ماتم کریں۔ اسی حالت میں دوبارہ اماں کی دلہیز پر  
 آئیں، تو مہنتوں کبھی سنی گود بچہ کرہنٹیں اور کبھی خللاؤں  
 میں تھکتے ہوئے رویا کرتیں۔



اماں کو جوان بیٹی کا دکھ مارے ڈال رہا تھا۔ اپنا  
کی کمر مزید دسری ہو گئی تھی۔ ایسے میں بھتیہ ہی تھے جنہوں  
نے سب کو سہارا دیا۔ اور آسیرنی کو خاص طور سے سنی  
کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ انہیں سنی کے لیے زندہ  
رہنا ہے۔ پھر وقت خود بڑا مرجم ہے۔ آہستہ آہستہ  
ہی سہی، درد کے الاؤ سے نکال ہی لایا۔

زندگی کچھ معمول پر آئی تو اماں کو ایک بار پھر آسیرنی  
کی فکر ہوئی۔ کوئی اتنی زیادہ عمر بھی نہیں تھی ان کی، بلکہ  
ان کے ساتھ کی کافی لڑکیاں تو اب تک کنواری بیٹھی  
تھیں۔ اماں ان کے عقد ثانی کے لیے چاہتی تھیں کہ  
کوئی شریف خاندان کا بندہ ہو، جو سنی کے سر  
پر بھی دستِ شفقت رکھ سکے۔ اس دوران ایک رشتہ  
آیا تھا، جو ویسے تو ٹھیک ٹھاک تھا، لیکن اس کی پہلی  
بیوی روٹھ کر بیٹھے بیٹھی تھی اور اماں کوئی رسک لینے پر  
تیار نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا، روٹھے ہوئے کبھی بھی  
مان سکتے ہیں اور ایسی صورت میں آسیرنی کے لیے  
خاصی مشکلات کھڑی ہو جائیں۔

پھر اب ڈاکٹر شیرازی کی والدہ آئی تھیں اور اگر جو  
آسیرنی اب تک کنواری بیٹھی ہوئیں تو اماں ان سے  
ضربہ پوچھتیں کہ پہلے جس چوکھٹ پر آنا انہوں نے  
گوارا نہیں کیا تھا، اس پر اب کیسے چلی آئیں، لیکن اماں  
مجبور تھیں کہ بیٹی نہ صرف بیوہ بلکہ گود میں بچہ بھی لیے  
ہوئے تھی، پھر بھی انہوں نے اپنی واحد مشرطان کے  
سامنے ضرور دکھ دی تھی کہ بچہ، آسیرنی کے ساتھ رہے  
گا۔ اگر شیرازی بچے کو محبت کے ساتھ قبول کرتے ہیں  
تو ٹھیک، ورنہ وہ دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ  
کریں۔

پھر آسیرنی سے زیادہ اماں کو ڈاکٹر شیرازی  
کی والدہ کی دوبارہ آمد کا انتظار رہا۔ اور جب تک  
وہ آنے لگیں، اماں مسلسل یقین اور بے یقینی کی فضاؤں  
میں ڈولتی رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں انہیں یقین تھا کہ  
آسیرنی، ڈاکٹر شیرازی کے ساتھ بہتر زندگی گزار سکیں  
گی اور بچے کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔  
بہر حال شیرازی بچے کے سر پر دستِ شفقت  
رکھنے کو تیار تھے اور پھر یہ کہ دونوں طرف عقد ثانی

والی بات تھی۔ اس لیے کوئی خاص مہم دوسرا نہیں  
ہوا۔ بس خاص خاص عزیزوں کو بلایا گیا اور یوں  
آسیرنی ڈاکٹر شیرازی کے تنگ نہایت ہو کر ان کے  
گھر آ گئیں۔ یہاں بھی ان کا کوئی خصوصی استقبال نہیں  
ہوا، بہت خاموشی سے انہیں شیرازی کے کمرے میں  
پہنچایا گیا۔ پھر جب شیرازی کمرے میں داخل ہوئے تو  
ان کا انداز بھی بہت عام سا تھا۔ بازوؤں میں پیٹ خالی  
سو رہی تھی۔ انہوں نے بہت آہستگی سے آستے بند کر  
لٹایا اور اس کے کسمانے پر پاس بیٹھ کر آہستہ آہستہ  
تھپکنے لگے۔ پھر جب اس کے سونے کا یقین ہو گیا تو  
وہیں بیٹھے بیٹھے آسیرنی کی طرف دیکھنے لگے، جو ذرا سی  
پلکیں اونچی کر کے ان کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں، جو  
بچی کو تھکتے تھکتے وہیں ٹھہر گئے تھے۔

اگر پانچ سال قبل ملن کی یہ رات آئی ہوتی تو یقیناً  
اس کمرے کی فضا مختلف ہوتی۔ سرٹے معنی خیز مسکراہٹ  
کے ساتھ اپنی طرف تکتی ہوئی ہوتی۔ ایک طرف مدھسر  
سرگوشیوں میں بے تابیاں ہوئیں تو دوسری طرف ہونٹوں

پر سر میگیں مسکراہٹوں کی کلیاں کھلتیں، لیکن اب ایک جامد  
خاموشی دونوں اپنی اپنی جگہ حیران کیا کہیں کیا سنیں۔  
نہ بے تابیاں، نہ بے قراریاں۔ سوا جنبی بھی جب ایک بار  
قبول کے مراحل سے گزر کر اس مقام تک آتے ہیں  
تو جنبی نہیں رہتے اور یہاں اثنا صاحب تھا کا جنبی نہ  
ہوتے ہوئے بھی اجنبی بن رہے تھے۔  
”کیسی ہیں آپ؟“ کافی دیر بعد شیرازی نے ایک  
رسی سا جملہ بول کر خاموشی کو توڑا، تو وہ سر اٹھا کر ان کی  
طرف دیکھنے لگیں۔

ان کے مزاج میں شوخی و رنگینی تو پہلے بھی نہیں تھی  
لیکن اب تو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ لگ رہے تھے۔  
”آپ کیسے ہیں؟“ جواب میں انہی کا سوال دہرا کر  
انہوں نے سر جھکا لیا، تو وہ ذرا سا مسکرائے، پھر اٹھ کر  
ان کے پاس چلے آئے۔

”آسیرنی! ہم زندگی کے جن امتحانوں سے گزر کر  
ایک دوسرے تک آئے ہیں، وہ امتحان ابھی تم نہیں  
ہوئے، بلکہ زندگی کی آخری سالنوں تک ہمارے  
ساتھ ساتھ چلیں گے۔“



وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں تو وہ وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”مجھے سنی کا باب بننا ہے اور آپ کو شرہ کی ماں، یہی جارا امتحان ہے اور ہم اس میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔“

”میں شرہ کو سنی کی طرح عزیز رکھوں گی؟“ آسیہ فوراً کہہ کر ان کی طرف دیکھنے لگیں کہ جواب میں وہ بھی ایسی ہی بات کریں گے۔ سنی کو شرہ کی طرح عزیز رکھنے کی، لیکن وہ خاموش رہے، پھر اٹھتے ہوئے صاف گوئی سے بولے۔

”میں فوری طور پر ایسا کوئی دعوہ نہیں کر سکتا، البتہ کوشش کروں گا کہ نپتے کو کسی کی کا احساس نہ ہو۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرینگ روم میں چلے گئے اور آسیہ بی بی کے اندر ابجانے اندھے سر اٹھاتے کو تیار تھے کہ پھر فوراً انہیں یاد آیا کہ پانچ سال قبل بھی شیرازی نے اسی طرح صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ انہیں کوئی جھوٹی آس دلانے کے بجائے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ کبھی بھی اُمّی کو قائل نہیں کر سکیں گے، اگر وہ

چاہتے تو ایک طویل عرصہ انہیں انعطاف کی سولہ پر لٹکا سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر ان سے دستبردار ہو گئے تھے، لیکن آج پھر وقت انہیں قریب لے آیا تھا اور اس مقام پر بھی وہ کوئی جھوٹا دعوہ کرنے کے بجائے صاف بات کر گئے تھے۔ ان کی صاف گوئی کو کہہ کر تکلیف دہ تھی، پھر بھی گہری بات یاد کر کے آسیہ بی بی نے یقین کا دامن تھام لیا کہ آج نہیں تو آنے والی کسی بھی کل شیرازی بھی دعوہ ضرور کریں گے۔

یہ گھر جتنا بڑا تھا۔ اس کے مکینوں کی تعداد بھی کافی تھی شیرازی کے بڑے بھائی ان کی بیوی اور تین بچے۔ شیرازی سے چھوٹے بھائی بھی اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ یہیں مقیم تھے۔ ہر ایک کے ہتھ میں دو دو کمرے تھے۔ ساتھ الگ الگ کچن بھی تھے، لیکن وہ اسی وقت استعمال ہوتے، جب ان کے اپنے الگ سے کوئی جہان آتے، ورنہ کھانا ایک ہی جگہ پکنا اور ایک ہی جگہ کھایا جاتا تھا۔ اور اس پورے گھر کا انتظام ان کی اُمّی جان ہی

کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے قینوں بیٹے بیوی بچوں کو لے ہونے کے باوجود ان کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کرتے تھے۔ ان کی ہر بات کو یا حکم کا درجہ دیتی تھی۔ اس کے علاوہ شیرازی کی تین بہنیں بھی تھیں۔ دو تو اپنے گھر بار والی تھیں اور سب سے چھوٹی سیما بی۔ اسے میں بڑے حد ہی تھی۔

جس طرح بیٹے ماں کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرتے تھے، اس طرح بہو میں بھی ان کی تابعدار تھیں۔ گو کہ اُمّی جان سخت گیر خاتون نہیں تھیں، لیکن ان کا انداز ہی کچھ مختلف سا تھا۔ بچہ بچہ اہوا اور نظروں میں ہمہ وقت تنبیہی پر چھائیوں قص کرتی نظر آتیں کہ مقابل بولنے سے پہلے سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر آسیہ بی بی کے ساتھ مختلف معاملہ یوں تھا کہ وہ بار کر جیتی تھیں اور ان کے مقابلے میں اُمّی جان جیت کر ہاری تھیں اور اس مقام پر انہوں نے یہ سوچ کر کہ کبھی آسیہ اپنی جیت کو ان پر جتانہ دے، اپنا رو تہ سخت کر لیا تھا، گو کہ آسیہ بی بی ایسی جرأت کبھی نہیں کر سکتی تھیں، بلکہ انہوں نے تو اس انداز سے

## شوکت تھاوی کی مزاحیہ کتابیں

ہم زلف	مسکرامیں	خطی
30/-	12/-	30/-
پگلی	مکرر ارشاد	پہیلی بیگم
15/-	12/-	20/-
بہر و پیا	لاحول لا قوۃ	خواہ مخواہ
6/-	15/-	30/-

سورپڑ سے زائد قیمت کی کتابیں منگوانے پر 20% رعایت

شفیع برادرز  
پوسٹ بکس 586  
کراچی 74200



گنجا کٹھن ہے۔

پھر وہ اب تک وہاں کیوں ہے؟

مجھے آپ کی اجازت دے کر تھی کہ اپنے نہیں آسیدنی  
انہیں مقبرہ کو ہی تھیں، لیکن انہیں شاید اس متوسط طبقے  
کی لڑکی کی طرف سے دی گئی مستحضر کی ضرورت نہیں تھی۔  
بہجہ نرم کرنے کے بجائے مزید سخت کر سکتے ہوئے وہ  
کہنے لگیں۔

اجازت کیسی، جبکہ تم تو اسے نکاح میں اپنے ساتھ  
لکھوالا ہی تھیں اور اس لحاظ سے ہم اسی وقت اس کی  
پرورش کرنے کے پابند ہو گئے تھے۔

آسیہ بی کا دل چاہا، وہ اسی وقت انہیں اس  
پابندی سے آزاد کر دیں اور کہیں، مجھ میں اتنی محبت  
ہے کہ میں اپنے بچے کو خود پرورش کر سکوں، لیکن پھر  
یہ گھر، یہ سا بھان اور بقول اماں کے اب آسیہ بی کے  
لیے اس سے ہٹ کر کہیں جائے پناہ نہیں تھی پھر ابھی  
انہیں یہ مان بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ رو نہیں گئی، تو  
کوئی مناتے مناتے اسے لے گا، اس لیے دکھ کے احساس  
کو اندر ہی اندر دباتے ہوئے بولیں۔

یہ آپ کی اعلا ظرفی ہے اتنی جان کہ میرے بچے  
کے سر پر دستِ شفقت رکھ رہی ہیں۔ اگر آپ کہیں  
تو میں آج ہی اسے لے آؤں۔

ہاں، اتنی جان نے گویا احسان کیا۔  
وہ شکر یہ کہتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئیں۔  
پھر شام میں کلینک جاتے ہوئے شیرازی انہیں  
اپنے ساتھ لے گئے اور واپسی میں وہ سنی کو اپنے ساتھ  
لے آئیں۔

سال بھر کا سنی اتنے دن ماما سے دور رہ کر کھلا  
سا گیا تھا۔ انہیں اپنے بچے پر بے طرح پیار آیا۔ تمام  
راستہ بھی اسے سینے سے چٹائے رکھا اور گھر آکر بھی  
کتنی دیر تک اس میں لگی رہیں۔ جب اس کے سونے کا  
وقت ہوا تو اسے گود میں لے چھکنے لگیں۔

شیرازی نے کمرے میں آتے جاتے بہت خاموشی  
سے انہیں دیکھا۔ پھر جب اپنی جگہ پر لیٹے تو کہنے لگی۔  
تمہارا بچہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے، میرا خیال تھا  
شرہ کے برابر ہو گا۔

میں، ابھی پچھلے ہفتے ہی تو یہ ایک سال کا ہوا ہے۔

سو چاہی نہیں تھا، اس لیے اتنی جان کا اپنے لیے  
سخت رویہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا، جب کہ دوسری  
دونوں بہنوں کے ساتھ تو وہ بھلیک شاک تھیں۔

شادی کے بعد ابتدائی چند دنوں میں ہی آسیہ بی جان  
گئیں کہ انہیں اس گھر اور خاص طور سے اتنی جان کے  
دل میں جگہ بنانے کے لیے خالص کٹھن مراحل اور سر آڑما  
لحاحات سے گزرنا پڑے گا۔ اس لیے ان کی اولین کوشش  
یہ تھی کہ ان کی طرف سے کسی کوشکایت کا موقع نہ ملے۔

سنی ابھی تک اماں کے پاس تھا۔ انہوں نے مصلحتاً  
بچے کو اپنے پاس روک لیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ  
مرد ابتدائی دنوں میں کسی تیسرے وجود کو برداشت نہیں  
کرتا، لیکن یہاں ایک تیسرا وجود مٹرہ کی صورت میں پہلے  
سے موجود تھا۔ گوکہ مٹرہ زیادہ تر اتنی جان کے پاس رہتی  
تھی، لیکن جیسے ہی شیرازی کلینک سے آتے وہ پاپا پاپا  
کرتی ہوئی ان کی گود میں چڑھ جاتی۔ ایسے میں آسیہ بی کو سنی  
کا خیال آتا تو متا بے چین ہو جاتی۔ ویسے بھی شادی کو  
پندرہ دن ہو گئے تھے اور وہ چاہتی تھیں سنی کو اپنے  
پاس لے آئیں اور یہ بھی خواہش تھی کہ اس کے لیے  
شیرازی خود ان سے کہیں اور کہنا تو دور کی بات، وہ تو یوں  
انجان سے تھے، جیسے بچے کے وجود سے یکسر لاعلم ہوں۔  
اور خود سے کہنا آسیہ بی کو بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ  
بار اس ارادے سے بات شروع کی کہ سنی کو لانے کی  
بات کریں گی، لیکن ہر بار پتا نہیں کیوں بات بول تک  
آتے آتے رہ گئی۔ پھر ایک دن اتنی جان کو جانے کیسے  
خیال آیا۔ انہیں بلا کر کہنے لگیں۔

تم بچے کو اپنی ماں کے پاس چھوڑے ہوئی ہو آخر  
کیوں؟

آسیہ کے پاس اس کیوں کا جواب نہیں تھا، اس  
لیے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کے لیے یہاں جگہ نہیں  
ہے؟

نہیں، آسیہ بی گھر آکر بولیں۔

کیا نہیں؟

میرا مطلب ہے کہ میں ایسا نہیں سمجھتی بلکہ میرا  
خیال ہے بچے کے لیے اس گھر کے علاوہ گھر  
والوں کے دلوں میں بھی میری سوچ سے بڑھ کر



اس کے باپ نے اسے دیکھا یا نہیں، میرا مطلب یہی ہے۔

”اچھا! وہ ہلکے سے ہنسنے۔

”اگر میرے منہ سے انجانے میں کوئی غلط بات نکل گئی ہے، تو اس سے اپنے طور پر اندازے لگانا مت شروع کرو۔ یہ واقعی ہمارا بچہ ہے۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں ایک معصوم سے بچے سے کوئی ملاوت رکھوں گا۔“

آسیہ بی آن کی بات سن کر قدرے نامم ہوئیں، پھر کہنے لگیں۔

”آج اتنی جان بچے جبار ہی تھیں کہ انہوں نے بچے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔“

”دیکھو آسیہ! شیرازی پوری طرح اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”اتنی جان کی بات مت کرو، ان کے بارے میں یہ کہوں گا کہ تم پس آن کی بات سن لیا کرو۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے، وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔“

”یہ محض تمہارا وہم ہے، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ قدرے وقف کے بعد کہنے لگے۔

”میں یہاں ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لے گا پھر بھی کوئی دشواری پیش آئے تو پلین میری خاطر آسیہ۔“

”مجھے پس آپ کا ساتھ چاہیے شیرازی! پھر کوئی بھی دشواری، دشواری نہیں رہے گی۔“

”اپنی بات کے جواب میں کیا سننا چاہتی ہو؟ شیرازی نے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ نظریں آن پر جما دیں، تو وہ آن کی طرف دیکھ گئیں۔ کیا کہیں کہ جو سننا چاہتی تھیں، وہ تو آن کی نظریں کہہ ہی رہی تھیں۔

آسیہ بی چاہتی تھیں کہ ثمرہ آن سے مانوس ہو جائے، وہ حقیقتاً اسے اپنی مامتا کی چھاؤں میں لینا چاہتی تھیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں اتنی جان اسے زیادہ قریب سے رکھتیں۔ اس کے چھوٹے موٹے کام بھی خود ہی کیا کرتی تھیں۔ کئی بار آسیہ بی نے خود سے بڑھ کر کہا کہ لائے میں کروں، لیکن اتنی جان نے صاف منع کر دیا۔ پھر جب ثمرہ اسکول جانے لگی تب شاید صبح والی جھاگ دوڑائی جان سے نہ ہو سکی اور ثمرہ کو یونیفارم وغیرہ تھما کر آسیہ بی کے کمرے میں بھیج دیا۔

”آئی! مجھے تیار کر دیں! ثمرہ نے پہلی بار انہیں غلب

ہے، وہ اس کی پیدائش سے پہلے یا۔“

”شیرازی! انہوں نے لوگ دیا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں۔

”یہاں آتے ہوئے میں اپنی گزشتہ زندگی کو دیکھ چھوڑ آئی تھی بلکہ دفن کر آئی تھی، اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی کمی تھی یا محرومی تھی بلکہ آئندہ زندگی کی بہتری کے لیے۔ آپ مرو ہیں، اپنی مرحومہ بیوی کو علی الاعلان بلوریں گے تو اسے آپ کی اس کے ساتھ وفاداری تصور کیا جائے گا، بلکہ ٹھیک بنالیں بھی دیں گے، اس کے برعکس میرے ہونٹوں پر اگر کبھی بھولے سے بھی میرے مرحوم شوہر کا نام آ گیا تو اسے میری آپ کے ساتھ بددیانتی قرار دیا جائے گا، اس لیے کہ میں عورت ہوں اور ساری مجبوریاں عورت ہی کے نصیب میں رکھی گئی ہیں، لیکن یہ مت بھولے گا کہ میں ایک ماں بھی ہوں اور ماں بنتے ہی عورت ساری مجبوریوں، ساری محرومیوں کو شکست دینے کا حوصلہ پیدا کر لیتی ہے۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ شیرازی تکیہ اونچا کر کے خود بھی اونچے ہو کر بیٹھے اور بغور آن کی طرف دیکھنے لگے۔

”میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے اس لیے شادی نہیں کی تھی نہ بچے کی پرورش نہیں کر سکتی تھی بلکہ اس لیے کہ بچہ کسی محرومی کا شکار نہ ہو۔ ابھی یہ بہت چھوٹا اور معصوم ہے اس بات سے بیکسر لاعلم ہے کہ اس کا باپ کون ہے اور میرا دوبارہ اتنی جلدی شادی کر لینے کا مقصد ہی یہ ہے کہ جو شخص اس کے سامنے آئے گا، یہ اسے ہی اپنا باپ سمجھے گا، اگر میں صرف اپنے بالے میں سوچتی تو ہو سکتا ہے اگلے دس سال تک مجھے شادی کا خیال نہ آتا، لیکن اس وقت بچہ کسی دوسرے شخص کو متعلق ہی سے قبول کرتا اور اس کی شخصیت و حوصلوں میں ترقی ہو جاتی اور ایسا میں نہیں چاہتی تھی و

”اور اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”میرے پاس اس بچے کے لیے کوئی بے چارے کا مطلب نہیں ہیں، میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ابھی جو آپ نے اسے تمہارا بچہ کہا، تو آئندہ ایسی غلطی مت کیجیے گا۔ یہ ہمارا بچہ ہے، ہم دونوں کا، جس طرح ثمرہ ہماری

223



کیا بھی تو آئی کہہ کر۔

انہوں نے حیران ہو کر شیرازی کی طرف دیکھا، پھر  
ثمرہ کو گود میں اٹھالیا۔

”بیٹا! آئی نہیں، میں تمہاری ممتی ہوں۔“

”نائیں۔“ بچی نے سر کو زور سے نفی میں ہلایا۔

دادی جان نے کہا ہے، آپ آئی ہیں۔“

”اچھا!“ آسیہ بی نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر  
دیا۔ کیونکہ وہ جان گئی تھیں کہ امی جان کی بات سے کوئی

اختلاف نہیں کر سکتا۔ بہر حال انہیں ذکر ضرور ہوا تھا، اسی

بے بہت خاموشی سے ثمرہ کو تیار کیا۔ پھر اپنے ساتھ لے

جا کر ناشتا کرایا۔ اتنے میں اس کی اسکول وین آگئی۔ اُسے

بھج کر دوبارہ کمرے میں آئیں، تو اسی خاموشی سے شیرازی

کے کپڑے نکال کر پرس کرنے لگیں۔

شیرازی نے نہ صرف ان کی غیر معمولی خاموشی کو

محسوس کیا، بلکہ سبب بھی جان گئے تھے۔ وہ کپڑے

پرس کر کے کمرے سے جانے لگی تھیں کہ شیرازی

پکار کر کہنے لگے۔

”سنو! چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے آپ پر طاری مت

کیا کرو؟ انہوں نے شاکی نظروں سے دیکھا۔

”ثمرہ تمہیں آئی کہے یا ممتی، اس سے کیا فسق

پڑتا ہے؟“

”کیا واقعی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟“

”میرا خیال ہے۔“ شیرازی کندھے اچکا کر رہ

گئی۔

”مجھے واقعی کوئی فرق نہیں پڑے گا شیرازی، لیکن

ثمرہ کو ضرور پڑے گا۔“

اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئیں۔

پھر یہ ان کی محبت تھی کہ ثمرہ چند دنوں میں ہی

ان سے مائل ہو گئی۔ نہ صرف صبح کے وقت بلکہ اسکول

سے آنے کے بعد بھی زیادہ تر ان کے گرد منڈلاتی رہتی

اور یہی بات امی جان کو پسند نہیں آئی۔ حالانکہ انہیں

خوش ہونے کے ساتھ مطمئن ہو جانا چاہیے تھا، کہ

آسیہ بی اپنی اولاد کی طرح اس سے محبت کرتی تھیں۔

اس کا خیال رکھ رہی تھیں، لیکن شاید وہ آسیہ بی کی

اہمیت تسلیم کرنا چاہتی تھیں نہ ہی انہیں سرخرو

دیکھنا چاہتی تھیں۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ آسیہ بی

ثمرہ کے ساتھ سوتیلی ماؤں جیسا سلوک کریں گی، تو

انہیں ٹوکنے کا موقع مل جائے گا، لیکن جب آسیہ کوئی

موقع ملتا ہے تو وہ نہ ہی ان کے بار بار منع کرنے

کے باوجود ثمرہ، آسیہ بی کے گرد منڈلانے سے باز آتی

تھیں وہ ان دونوں کے درمیان فاصلے پیدا کرنے کے

اور طریقے سوچنے لگیں۔ خاصی حکمت عملی سے کام

لیا تھا انہوں نے کہ سانب بھی مر جائے اور لاسی

بھی نہ ٹوٹے۔ جب آسیہ بی نے ایک۔ بیٹے کو

جنم دیا، تب وہ شیرازی سے کہنے لگیں۔

”میرا خیال ہے ثمرہ کو مری کا فونیٹ میں داخل

کر دیا کرو میں ہاسٹل میں اس کی رہائش کا انتظام کر دوں

شیرازی تو دیکھیں، سوچتے رہ گئے جبکہ آسیہ بی

کے لبوں سے بے اختیار پھیل گیا۔

”دیکھیں امی جان؟“

”میں تمہاری وجہ سے کہہ رہی ہوں۔ تین بچوں

کو سنبھالنا خاصا مشکل ہو گا۔ ثمرہ اسکول جانے والی

ہے۔ تم چھوٹے کو دیکھو گی یا۔ اور پھر ابھی تو تم

خود بستر پر پڑی ہو۔“

”میں اکیلی نہیں ہوں امی جان، آپ میں، بھابی

جان وغیرہ میں اور پھر چند دنوں کی تو بات ہے۔“

”چند دنوں کی بات نہیں ہے۔“ امی جان کا ہج

بھی ہی بدلا، شیرازی نے آسیہ بی کو خاموش رہنے کا

اشارہ کیا، پھر امی جان سے کہنے لگی۔

”اگر آپ یہی مناسب سمجھتی ہیں تو جھٹک ہے ثمرہ

کو مری کا فونیٹ میں داخل کروا دیتا ہوں۔“

”ہاں ثمرہ کے لیے یہی بہتر ہے۔“ امی جان نے کہا

اور کمرے سے نکل گئیں تو آسیہ بی، شیرازی پر نظریں

جماتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگیں۔

”نہیں شیرازی! ثمرہ کے لیے یہ بہتر نہیں ہے آپ

اس معصوم بچی کو کیوں خود سے الگ کر رہے ہیں؟“

”یہ امی جان کا حکم ہے۔“

”جھٹک ہے، لیکن ثمرہ بھی آپ کی اولاد ہے، امی

جان کا حکم مانتے ہوئے آپ کو ثمرہ کی ذات سے نظریں

نہیں چرائی جائیں۔“

”ان کے خاموش رہنے پر کہنے لگیں۔“

”اس گھر میں میں پہلی عورت نہیں ہوں جس کی



اور میں تیسرا بچہ آیا ہے۔ مجھ سے پہلے دو عورتیں اور  
میں نے سال سال پر بچے پیدا کیے ہیں، ان  
نے تو کسی بچے کو حامل نہیں سمجھا گیا، پھر ہماری بچی کو ہم  
سے الگ کرنے کا حکم کیوں سنایا گیا ہے؟

”ہیز آسیہ! شیرازی کچھ جھجلائے گئے۔  
”مجھے ان باتوں میں مت الجھاؤ۔ اتنی جان نے کچھ  
سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا اور میں سمجھتا ہوں ان کے  
فیصلے کبھی غلط نہیں ہوتے۔“

آسیہ بی نے تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھا  
پھر کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔  
”کاش ثمرہ نے میری کوکھ سے جنم لیا ہوتا تو آج  
میں خود اتنی جان کے فیصلے سے ٹکرا جاتی۔“

آسیہ بی نے ثمرہ کو جنم نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود  
وہ اس کے جانے سے بے حد آزرہ تھیں۔ شیرازی  
کو پتا نہیں اندازہ تھا یا نہیں، لیکن وہ اچھی طرح جانتی  
تھیں کہ اس طرح ثمرہ کی شخصیت کسی نہ کسی پہلو سے ضرور  
اوجھری رہ جائے گی۔ ان کی جگہ اگر اس کی سگی ماں ہوتی  
تب اور بات تھی۔ اب جیسے جیسے وہ بڑی ہوگی یقیناً  
اس انداز سے سوچے گی کہ اسے سوتیلی ماں کی وجہ سے  
گھر سے دھڑ بھڑا اور آسیہ بی نے سوتیلی ماں بننے  
کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اس بات پر  
ایمان رکھتی تھیں کہ جو چیز اپنے لیے پسند کرو، وہی دوسروں  
کے لیے، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ جس طرح وہ سنی کے لیے  
سوچتی تھیں، ویسا ثمرہ کے لیے نہ چاہیں۔

”میں ثمرہ کو سنی کی طرح عزیز رکھوں گی۔ انہوں  
نے اول روز شیرازی سے یوں ہی نہیں یہ بات کہہ دی  
تھی۔ انہیں واقعی ثمرہ بے حد عزیز تھی اور وہ چاہتی تھیں  
کہ ان کے بچوں میں کوئی فرق نہ رہے، لیکن اتنی جان  
نے ثمرہ کو دودھ کر کے اس فرق کو نہ صرف واضح بلکہ شاید  
ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ بہر حال آسیہ بی اس  
اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی تھیں، سوائے کڑھنے کے۔  
وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ اگلے چار  
پانچ سالوں میں آسیہ بی نے دواور بیٹوں کو جنم دیا۔  
یوں ثمرہ کے لیے ان کے دل میں محبت کی جڑیں آپ  
ہی آپ اور مضبوط ہو گئیں۔ ثمرہ سال میں ایک بار

بس چھٹیوں میں آتی تھی۔ اس عرصے میں وہ اس کے بہت  
ناز اٹھاتیں اور اب تو وہ شیرازی سے کہنے لگی تھیں کہ  
سنی اور سعد اسکول جانے لگے ہیں۔ چھوٹے دونوں بھی  
آنا تنگ نہیں کرتے۔ ثمرہ کو سنی بلالیں اور شیرازی  
کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”اتنی جان جب مناسب سمجھیں گی، بلا لیں گی۔  
اور وہ خاموش ہو جاتیں۔

ان دنوں ثمرہ آتی ہوتی تھی اور حسب سابق آسیہ بی  
اس کی ناز برداریاں اٹھانے میں مصروف تھیں۔ اس  
وقت بھی ثمرہ نے کسٹرڈ کھانے کی فرمائش کی اور آسیہ بی  
جھٹ کچن میں پہنچ گئیں۔ حالانکہ رات زیادہ ہو جانے  
کے سبب چھوٹے دونوں سونے کے لیے بورڈ ہے  
تھے اور شیرازی نے کہا بھی کہ پہلے ان دونوں کو سلاؤ  
لیکن وہ ”بس ابھی آئی، کہتے ہوئے چلی گئیں۔ جھٹ  
کسٹرڈ تیار کیا اور لے کر آئیں تو دیکھا، سنی کونے میں  
چپ چاپ بیٹھا تھا، جبکہ ثمرہ۔ میڈلر سعد اور چھوٹے  
دونوں کے ساتھ کھینے میں مصروف تھی اور شیرازی  
دلچسپی سے انہیں کھیلنے دیکھ رہے تھے۔ سنی  
کو یوں الگ تھلگ اور چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر آسیہ  
کے اندر انجانا درد کر دیا۔ یقیناً دل چاہتا تھا کہ وہ  
کر بازوؤں میں بھر لیں، لیکن مصلحتاً نظریں پھاڑ گئیں  
ہاتھ میں پکڑا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے قدرے  
اوپنی آواز میں بولیں۔

”لو بھئی، پتھو! کسٹرڈ تیار ہے۔ پھر سنی کو دیکھ کر  
بظاہر عام سے ہجے میں کہنے لگیں۔  
”سنی! تم وہاں کیوں بیٹھے ہو بیٹا، یہاں آؤ ناں؟  
”نہیں تھی! ثمرہ بی مجھے اپنے ساتھ نہیں کھلا  
رہیں۔“

”ثمرہ بی بی! وہ حیران ہوئیں۔  
”بیٹا! یہ تمہاری باجی ہیں، ثمرہ باجی۔  
”نہیں! آئی! میں اس کی باجی نہیں ہوں۔ میں  
صرف سعد، نومی اور بیٹی کی باجی ہوں، سنی میرا بھائی  
نہیں ہے۔“  
ثمرہ نے فوراً ٹوکتے ہوئے وضاحت بھی کر دی  
کہ وہ کس کی بہن ہے اور کس کی نہیں۔  
”تم سے کس نے کہا کہ سنی تمہارا بھائی نہیں ہے؟“



آسیہ بی نے گھٹے فرش پر ٹیک لے لے اور کہنیاں بیڈ پر لگاتے ہوئے پوچھا۔

”دادی جان نے“ مقررہ نے اطمینان سے جواب دیا۔  
”اچھا“ اندر کا ڈکھ ایک عجیب سی ہنسی کی صورت میں آسیہ بی کے ہونٹوں پر آیا اور وہ آٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہمیشہ کی طرح شیرازی کی طرف دیکھ کر اس بات کو غلط قرار دینے کی کوشش نہیں کی۔

چپ چاپ چھوٹی پیالیوں میں کسٹرڈ نکالا اور سب بچوں کے سامنے رکھ دیا پھر دوسری طرف سے آکر چھوٹے دونوں کے پاس بیٹھ کر انہیں اپنے ہاتھ سے کھلانے لگیں۔  
”اچھا آئی! اب میں سونے جا رہی ہوں۔“

مقررہ اپنا کسٹرڈ ختم کرتے ہی کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے چاہا، اسے یونہی جانے دیں، لیکن دل نہیں مانا۔ روزانہ کی طرح پاس بلا کر اس کی پیشانی چومی اور شب خیر کہا۔

پھر جب سب نے کسٹرڈ کھا لیا تو پیالیاں میٹ کر کچن میں رکھنے چلی گئیں۔ واپس آکر بہت خاموشی سے بچوں کو منگایا اور خود بھی لیٹ گئیں۔ انہیں حقیقتاً مقررہ کی باتوں سے بہت ڈکھ ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں اس میں مقررہ کا قصور نہیں ہے، یوں اس کے لیے ان کے دل میں ایسی کوئی بات نہیں آتی، جو انہیں اس سے متنفر کرے۔ البتہ امی جان جو مقررہ کے کچے ذہن میں ایسی باتیں بٹھا رہی تھیں، ان کے بارے میں وہ ضرور سوچنے لگیں کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں، پھر جس طرح سنی نے اُسے مقررہ بی بی کہا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مقررہ کے مقابل سنی کو کیا مقام دے رہی ہیں۔  
”آسیہ! سو گئیں کیا؟“ شیرازی نے پوچھا۔

وہ آنکھیں بند کر کے سوتی بن گئیں۔

اصل میں وہ اس وقت ان سے بات نہیں کرنا چاہتی تھیں، کیونکہ ایک تو اندر بن رہا تھا۔ دوسرے دل کچھ اس طرح بھرا رہا تھا کہ ہونٹ ملتے ہی آنکھیں بھی جھپک پڑیں۔ پھر اس شخص سے وہ کیا کہتیں، جو تعیناً جواب میں ایک ہی جملہ کہتا۔ ”امی جان جو مناسب تمہیں لگی کریں گی۔“

پھر اب تک تو انہوں نے یہ دیکھنے یا غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ شیرازی کا رویہ سنی کے ساتھ کیا ہے، لیکن اب خاص طور سے نوٹ۔

کرنے لگیں۔ شیرازی اگر سنی سے محبت نہیں کرتے تھے تو ان کے کسی انداز سے نفرت یا اس کے وجود سے ناگوارگی بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ البتہ لائق ضرور تھی۔ نہ ہی اسے کسی بات پر ٹوکتے تھے، خواہ وہ کوئی غلط کام ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔ بس دیکھتے اور گزار جاتے جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ جیسے ایک دم دل سے کہہ دیا۔  
”میری بلا سے کچھ بھی کرے۔“

اگر وہ نادان ہوتیں تو یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتیں کہ اچھی بات ہے، وہ میرے بچے کو کچھ نہیں کہتے، لیکن وہ نادان نہیں سمجھیں، اس لیے ان کے رویے نے انہیں خاصی تکلیف پہنچائی کہ جس محرومی سے سنی کو بچانے لیے انہوں نے شادی کی تھی، وہ محرومی اس کے دامن سے لیٹ رہی تھی۔

انہوں نے سنی کا جائزہ لیا تو وہ بار بار انہیں یاس و حسرت کی تصویر بنا نظر آتا۔ کبھی اپنے تینوں بھائیوں میں سے کسی کو شیرازی کی گود میں چڑھے دیکھ کر کبھی سب بچوں کو کھیلنے دیکھ رہا ہوتا۔ کوئی کہتا، سنی کو بلاؤ تو باقی سب مخالفت کرنے لگتے۔

”نہیں سنی! ہمارے ساتھ نہیں کھیلے گا۔“

کبھی امی جان سے خوفزدہ نظر آتا۔ آسیہ بی کو اپنے آپ پر حسرت ہوتی کہ وہ کیسے اتنی غافل ہو گئیں، یا انہیں یہ اعتماد کیوں رہا کہ جس طرح وہ مقررہ کو اپنی ہی اولاد سمجھتی ہیں، اسی طرح اور گھر والے سنی کو بھی سعد کی طرح سمجھتے ہوں گے، لیکن یہاں تو بچہ سنی کو اپنے سے الگ سمجھتا تھا۔ انہیں بے حد ڈکھ ہوا۔ کاش وہ اول روز ہی جان سکتیں تو کم از کم ایسے موقعوں پر اپنے بچے کو ہمارا تو دیتیں۔ کس قدر تنہا لگ رہا تھا وہ۔ سب سے الگ تھلک۔ دور کھڑا چپ چاپ سب بچوں کو کھیلنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”سنی! بیٹا میرے ساتھ آؤ۔“ وہ سنی کو لے کر اندر آگئیں اور اسے پاس بٹھا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے اسکول کی ٹیچر کی اور دوستوں کی تاکہ وہ بہل جاتے، لیکن اس کا دھیان ابھی تک ان میں کھلتے بچوں کی طرف تھا۔ جب آسیہ بی خاموش ہو گئیں تو پوچھنے لگا۔

”تم! یہ سب مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں کھلاتے؟“



”آپ ابھی چوٹے ہونا اس لیے“

”وہ لان میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔“

”سعد مجھ سے بھی چوٹا ہے۔“  
آسیہ بی بی جواب ہوئیں، تو بات بدلتے ہوئے

”امی جان کو یقیناً اطمینان بھرے جواب کی توقع نہیں تھی، بگڑا کر بولیں۔“

”نومی اور منی ابھی چوٹے میں تھے انہیں دوسرے بچوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ دیا؟“

”اچھا یہ بتاؤ آپ کو کون اچھا لگتا ہے؟“  
”نومی بی بی!“ وہ جلدی سے بولا۔ پھر کپسوج انداز

”سعد ہے ان کے ساتھ کوئی بات ہوگی تو وہ آکر بتائے گا۔“

”لیکن تمی! نومی بی بی کہہ رہی تھیں، میں ان کا بھائی

”آسیہ بی غالباً نہ اٹھنے کا تہہ کر چکی تھیں۔“

”نہیں ہوں۔“  
”آپ سعد کے بھائی ہو، نومی اور منی کے بھائی ہو۔“

”گویا تم اس انتظار میں ہو کہ سعد آکر بتائے کہ نومی یا منی کو چوٹ لگ گئی ہے، تب تم آکر جاؤ۔“

”نومی اور منی تو پاپا کے بھائی ہیں۔“

”آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں، میں ابھی بچوں کو دیکھ کر آ رہی ہوں۔ سب آرام سے کھیل رہے ہیں۔“

”بھائی نہیں بیٹے!“ وہ تصحیح کرتے ہوئے بولیں۔

”امی جان کو آسیہ بی کا برابر سے جواب دینا بالکل اچھا

”اور میں؟“  
”آپ میرے بیٹے ہو۔“

”نہیں لگا، لیکن مزید سخت رویہ اس لیے اختیار نہیں کیا

”پاپا کا نہیں ہوں؟“  
”پاپا کے بھی ہو۔“

”کہ آسیہ بی کا بدلا ہوا انداز دیکھ کر جان گئیں کہ جواب میں

”پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید ایسے سوال کر کے

”وہ بھی اپنی آواز اُچھی کر لیں گی اور ان کی جرات دیکھ کر دوسری بھویں بھی کپڑے نکالنے لگیں گی یہی سوچ کر

”جواب کر دیتا، وہ کہنے لگیں۔“

”امی جان بات ختم کرنے کی غرض سے بولیں۔“

”اپنا بیگ لے کر آؤ، میں آپ کو ہوم ورک کروادوں۔“

”بھلاؤ۔“

”امی جان اپنے کسی کام سے وہاں آئیں، لیکن جب

”اس کے ساتھ ہی امی جان کمرے سے نکل گئیں اور

”آسیہ بی نے سوچا شاید بات ختم ہوگئی۔ لیکن بات ختم نہیں

”ہوئی تھی۔“

”تم یہاں بیٹھی ہو، دوسرے بچوں کی بھی خبر ہے؟“

”جب شیرازی کلینک سے لوٹے تو برآمدے ہی

”اور اب تک محض اسی خوف سے کہ کہیں کوئی یہ

”سے امی جان نے انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔“

”نہ کہہ دے کہ وہ سنی کو دوسرے بچوں پر فوقیت ہے

”اس وقت آسیہ بی کچن میں مصروف تھیں، اس لیے

”دہی ہیں سنی سے غافل رہیں، لیکن اب وہ اپنے بچے

”انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد وہ سب کو

”سے غافل نہیں رہ سکتی تھیں۔ انہوں نے یہ بات سوچی

”کھانے کے لیے بلانے آئیں تو شیرازی کمرے میں

”تھی اور ابھی امی جان آکر جتا رہی تھیں۔“

”موجود نہیں تھے۔ سنی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی

”لحمہ بھر کو آسیہ بی خوفزدہ ہوئیں، جیسے خودی کرتے

”نک آتے ہی نہیں۔“

”ہوئے پکڑی گئی ہوں، لیکن پھر فوڈ سنبھل گئیں۔ شاید

”یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اکثر کمرے کے سلسلے

”شیرازی کے تین بیٹوں کی ماں ہونے کا احساس جاگا

”میں انہیں دیر ہو جاتی تھی، اس لیے آسیہ بی کو تعجب نہیں

”تھا اور یہ احساس کمزور سے کمزور تر عورت کو بھی طاقتور

”ہوا، لیکن اس وقت وہ ضرور چونکیں، جب کھانے کے

”کمرے میں وہ امی جان کے ساتھ داخل ہوئے اور ان

”کے چیلے سے لگ رہا تھا کہ انہیں آتے ہوئے کافی دیر

کے تحت نہیں کرتے تھے  
نظر یا اس کے وجود سے  
نظر لا تعلق ضرور تھی نہ  
تھے، خواہ وہ کوئی غلط  
کئے اور جانتے جیسے  
دل سے کہہ دیا۔  
مطلوبہ ہو جاتی کہ  
نہیں کہتے، لیکن  
ہوئے نے نہیں  
کی کو بچانے  
کے واسطے

میں یا اس  
ماں میں  
سب  
وہ بتاتی

اپنے  
یا  
ولاد  
ح



ہو چکی ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ اتنی جان کا آن پر بس نہیں چلا تو دوایتی ساسوں والا حربہ استعمال کر رہی ہیں۔ کھانے کے دوران وہ مسلسل قیاس کرتی رہیں کہ اتنی جان نے شیرازی سے کیا کہا ہوگا اور اب شیرازی ان سے کس انداز میں بات کریں گے۔ ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر آنے والی صورت حال کے لیے تیار بھی کرتی رہیں۔

پھر جب وہ بچوں کو سلا کر کمرے میں آئیں تو شیرازی صوفے پر بیٹھے ہوئے کوئی فائل دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ خاموشی سے بیڈ کی چادر ہٹیک کرنے میں لگ گئیں۔ اس کام سے فارغ ہوئیں تو پوچھنے لگیں۔  
”آپ چائے پیئیں گے؟“  
”ہاں۔“

پھر سر اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا: ”نپتے سو گئے کیا؟“  
”ہاں۔“

”بہت جلدی سو گئے، ٹھیک تو ہیں سب؟“  
”سب ٹھیک ہیں، اچھا میں چائے لے آؤں۔“  
وہ کمرے سے نکل گئیں۔

کچھ دیر بعد چائے لے کر آئیں تو شیرازی اُسی طرح فائل میں آگے ہوئے تھے۔  
”کس کی فائل ہے؟“ وہ شیرازی کے قریب میز پر چائے کا کپ رکھ کر یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگیں۔

”ایک مریض کا کیس اسٹڈی کر رہا تھا۔“ انہوں نے فائل بند کر کے کنارے پر رکھ دی اور چائے کا کپ اٹھایا۔  
پھر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگی۔  
”تم چائے نہیں پیو گی؟“

”نہیں، پھر مجھے نیند نہیں آئے گی اور جلدی نہیں سونے تو صبح مشکل سے آنکھ کھلتی ہے۔“ آسیہ بی انجانے میں انہیں وہ موضوع فراہم کر گئیں جس کے بارے میں وہ سوچ رہے تھے کہ بات کیسے شروع کریں۔

”ہاں بچوں کو وجہ سے تمہیں صبح بہت جلدی اٹھنا پڑتا ہے اسی لیے میں سوچ رہا ہوں کہ سعد کو ٹمرہ کے پاس بھیج دوں۔“

”کہاں؟“ آسیہ بی کو اپنی سماعتوں پہ دھوکا ہوا جیسی فوراً پوچھنے لگیں۔  
”وہیں کالونیٹ سٹروک کے پاس۔“ انہوں نے اطمینان سے یوں دہرایا جیسے بہت دنوں سے سوچ رہے ہوں۔

جب کہ آسیہ بی سمجھ گئیں کہ یہ بچی اتنی جان نے پڑھائی ہے اور کیونکہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر چکی تھیں، اس لیے فوری جذبات میں آنے کے بجائے سنبھل کر اور قدرے لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولیں۔

”نہیں شیرازی! میں سعد کو کہیں نہیں بھیجوں گی۔“  
”اس کے لیے یہی بہتر ہے۔“ انہوں نے سمجھانا چاہا، لیکن وہ کچھ سننے پر آمادہ نہ ہوئیں۔  
”اس کے لیے کیا بہتر ہے کیا نہیں، ماں ہونے کے نلتے میں زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔“  
”لیکن آسیہ!“

”پلیز شیرازی! انہوں نے ٹولی دیا اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ میرا فیصلہ ہے کہ میں اپنے کسی بچے کو خود سے دور نہیں کروں گی۔“

شیرازی خاموش ہو رہے۔ ویسے بھی ان کی عادت تھی وہ کسی بات کو طول نہیں دیتے تھے۔ اور آسیہ بھی ان کی عادت سمجھنے کے باوجود پھر دھوکا کھا گئیں۔ اپنے طور پر سمجھ لیا کہ بات ختم ہو گئی۔ لیکن صبح اتنی جان نے ان کے کمرے میں آتے ہی یہی بات چسپور دی سی بی کو نظر انداز کر کے شیرازی سے پوچھنے لگیں۔

”تم سعد کو کب مری بھیج رہے ہو؟“ شیرازی جواب دینے کے بجائے آسیہ بی کی طرف دیکھنے لگے تو عجوبہ انہیں بولنا پڑا۔

”ہم سعد کو کہیں نہیں بھیج رہے اتنی جان۔ وہ یہیں رہے گا۔“

”تم خاموش رہو آسیہ۔ میں نے تم سے نہیں پوچھا۔ اتنی جان ناگواری سے بولیں۔“

”بات میرے بچے کی ہو اور میں خاموش رہوں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔“ پھر شیرازی نے لاکھ خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن وہ خاموش نہیں رہیں کہنے لگیں۔ آپ



نے تو اب تک اپنی اولاد کو سینے سے لگا کر رکھا ہوا ہے اور نچر سے چاہتی ہیں کہ میں انہیں خود سے دور کر دوں۔

”ہاں میں چاہتی ہوں کہ یہ بچے تم سے دور رہیں کیونکہ تم صرف سنی کی ماں ہو۔“  
”نہیں! آسیہ بی براہ راست اس حملے سے بچانے میں آگئیں۔“

”یہی بات ہے اور ایسے ماحول میں شیرازی کے بچے احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔ اسی لیے میں نے شرہ کو پہلے ہی یہاں سے ہٹا دیا تھا۔“ پھر جاتے جاتے شیرازی کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

”اب تمہاری مرضی میاں! جو بھی کرو۔“ شیرازی امی کے پیچھے کمرے سے نکل گئے اور آسیہ بی سر تقام کروہیں بیٹھ گئیں۔ پھر تقام دن وہ سوچتی اور الحقیق رہیں آخر میں جو فیصلہ کیا۔ اس سے رات میں پہلے شیرازی کو آگاہ کیا اور اگلے دن سنی کو لے کر اماں کے پاس چلی گئیں۔

”میری غلطی تھی کہ میں مقدر کے لکھے کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔“

وہ اماں کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگیں۔  
”سنی کے نصیب میں خروچی خود اوپر والے نے لکھی پھر میں اسے کیسے دور کر سکتی ہوں بھلا۔ آپ میرے بچے کو اپنے پاس رکھ لیں اماں! ورنہ اگر یہ وہاں رہا تو ایک ایک کر کے میرے سارے بچے مجھ سے دور کر دیے جائیں گے۔ وہ لوگ نہیں چاہتے کہ سنی ان بچوں میں شامل ہو۔ وہ اسے سب سے الگ سمجھتے ہیں۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ ”جس فرق کو میں مٹانا چاہتی تھی۔ وہ اول روز سے سب پر واضح کر دیا گیا ہے۔ یقین کریں اماں! میں تو شرہ کو اپنی اولاد سمجھتی ہوں۔ وہ مجھے کسی طرح بھی سنی سے کم عزیز نہیں ہے۔ اتنا دل چاہتا ہے وہ مجھے امی کے مکیں۔“  
آسیہ بی رو پڑیں۔ اور سنی بہت بڑا نہیں تھا، لیکن ایسے حالات کا شکار بچے کم سنی ہی میں خاصے سمجھا رہے جاتے ہیں وہ بھی پہلے چپ چاپ انہیں روتے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر پاس آیا اور ان کا چہرہ

ہاتھوں میں تقام کر کہنے لگا۔  
”نہی! میں نانی اماں کے پاس رہوں گا اور انہیں تنگ بھی نہیں کروں گا۔“

”میری جان! آسیہ نے اسے سینے سے بچنے دیا۔“  
”بس کرو۔“ بچہ پریشان ہو رہا ہے۔ ”اماں نے سنی کو الگ کر کے اپنے پاس بٹھایا پھر آسیہ سے کہنے لگیں۔ ”بیٹا صبر اور حوصلے سے کام لو! ایسا ہو جاتا ہے۔ عورت کو گھر بچانے کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔“

”میری یہ قربانی مہنگی پڑے گی امی جان کو! آسیہ! اس وقت ایسی ہی باتیں کر سکتی تھیں پھر بھی اماں سمجھانے لگیں۔

”نہیں لڑانی جھگڑے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم آرام سے اپنے گھر رہو۔ سنی کی فکر مت کرو، یہ یہاں خوش رہے گا۔ اور اس کا توناں ہی سکندر ہے۔ دیکھنا مقدر کا بھی سکندر ہو گا۔“  
”انشاء اللہ! آسیہ بی نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ

پاک و ہند میں ایکساں مقبول

شاعر وسیم بریلوی

کا محبوب و عہد کلام،

مزاج

قیمت 60 روپے

غزلیں اور گیت

شائع ہو گیا ہے،

سول ایجنٹ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی



خواہش ہے کہ وہ میرے پاس رہے۔ پھر منت بھرے  
لیجے میں بولیں۔  
”پلیز شیرازی! اُمّی جان سے کہیں وہ شرہ کو واپس  
بلا لیں۔“ شیرازی نے بہت خاموشی سے انہیں دیکھا  
پھر بس سر ہلا دیا تھا۔

ماہ و سال کا چکر چلا۔ کتنے برس بیتے۔ اس بار  
شرہ میٹرک کے امتحانوں سے فارغ ہو کر آئی تھی۔  
ہمیشہ سے مختلف اس کے اندازہ چوڑکانے والے  
تھے۔ پتا نہیں کسی اور نے محسوس کیا یا نہیں لیکن  
آسیہ بی غور کر رہی تھیں کہ وہ اپنی عمر سے خاصی  
بڑی لگنے لگی تھی۔ ہو سکتا تھا۔ اس میں مری کی  
آزاد فضاؤں کا دخل ہو پھر بھی آسیہ بی کا خیال  
تھا کہ اس عمر میں لڑکیوں کو ایک خاص نگرانی  
کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ  
شرہ اب یہیں رہے۔ لیکن پتا نہیں کیوں شرہ کے  
معاملے میں اُن کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔  
جب کہ وہ انہیں بے حد عزیمت تھی۔

پھر یہ جانتے کے باوجود کہ اُن کی بات کو کوئی  
اہمیت نہیں دی جائے گی انہوں نے پہلے شیرازی  
سے کہا کہ شرہ کو اتنی دُور بھیجنے کے بجائے یہیں  
کسی کالج میں داخل کرادیں۔ جواب میں شیرازی  
نے ہمیشہ کی طرح صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تو۔  
آسیہ بی نے مجبوراً اُمّی بات اُمّی جان سے کہی کہ  
عورت ہونے کے ناتے ہو سکتا ہے وہ بھی اس  
بات کو سمجھتی ہوں۔ لیکن اُمّی جان نہ دھڑکنے کا  
مظاہرہ کرتے ہوئے بولیں۔

”تمہیں شرہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“  
”کیسے ضرورت نہیں ہے۔ میں ماں ہوں اس  
کی؟“ آسیہ بی کو بھی غصہ آگیا۔

”سو تیلی ماں۔ جو کبھی اس کا بھلا نہیں سوچ سکتی۔“  
”آپ کی اس سوچ نے ہم ماں بیٹی کے درمیان  
خیلی حائل کر دی ہے۔ ورنہ وہ کبھی مجھ سے اتنی  
دُور نہ ہوتی۔“

آسیہ بی دُکھ اور تاسف سے کہتی ہوئی ان کے  
پاس سے اُٹھ آئیں بچوں کے کمرے میں جھانک کر

صاف کیا پھر سنی کو پاس بٹھا کر سمجھانے لگیں۔ ”نانی اماں  
کو تنگ نہیں کرنا۔ مائوں جان کے بچوں کے ساتھ لڑنا  
نہیں ہے۔ اسکول پابندی سے جانا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“  
شیرازی کو غالباً امید نہیں تھی کہ رات آسیہ بی نے  
جو فیصلہ سنایا ہے اس پر عمل بھی کر ڈالیں گی لیکن رات  
جب انہوں نے بچوں کے درمیان سنی کو نہیں دیکھا تو  
پوچھے بغیر رہ نہیں سکے۔

”سنی کہاں ہے؟“

”اسے میں اماں کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔“ آسیہ بی  
نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”کیوں؟“

”آپ شاید بھول گئے ہیں نے کل رات ہی آپ کو  
بتا دیا تھا کہ۔“

”ہاں لیکن۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر کہنے لگے۔  
”میرا خیال تھا تم یونہی غصے میں کہہ رہی ہو لیکن تم نے  
تو اپنی بات پر عمل بھی کر ڈالا۔“  
”کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟“ آسیہ بی  
براہ راست اُن کی طرف دیکھنے لگیں۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ جس بچے کو کسی خرونی  
سے بچانے کی خاطر تم نے اتنی جلدی دوبارہ شادی  
کی تھی وہی خرونی خود اس کا مقدمہ کر آئی ہو۔“  
”میں؟“ آسیہ بی کے اندر کی تلخی لیجے میں مٹ  
آئی۔ ”کس خوبصورتی سے آپ الزام میرے سر رکھ  
رہے ہیں۔ صاف اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ اس  
کا وجود آپ سب کے لیے ناقابل برداشت تھا۔“  
”یہ تمہاری اپنی سوچ ہے۔“

”اب آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور میں بھی یہ ضرور  
کہوں گی کہ زندگی کے جن امتحانوں کی آپ نے نشاندہی  
کی تھی اس میں آپ ناکام ہو گئے ہیں۔“  
”اور تم۔؟“ وہ فوراً پوچھنے لگے۔

”مجھے اس امتحان کے قابل ہی نہیں سمجھا گیا۔ ورنہ  
میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میری ناکامی کا سوال  
ہی نہیں تھا کیونکہ میں شرہ کو اپنے بچوں سے الگ  
نہیں سمجھتی۔ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے اور میری شہید



دیکھا۔ شرہ کا پی پر ڈرائنگ کرنے میں مصروف تھی جب کہ فومی اور بیٹی اس پر تھکے ہوئے تھے۔  
 ”یہ آپ نے ہٹ بنایا ہے۔ سعد دور ہی سے کیوں کر پوچھنے لگا۔  
 ”ہاں۔“

”اس میں کون رہتا ہے؟“ فومی اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

”اس میں ایک غریب شہزادہ رہتا ہے۔“  
 ”غریب شہزادہ؟“ سعد زور زور سے ہنسنے لگا۔  
 ”غریب شہزادہ کیسا ہوتا ہے؟ بیٹی نے پوچھا تو شرہ نے ذرا سا سراو بچا کیا اور پنسل غلے ہونٹ پر رکھ کر نظریں کاغذ پر جمی رہنے دیں۔ اس کی آنکھوں میں کئی رنگ ایک ساتھ اتر آئے تھے اور کسی خیال کے تحت ہونٹ دلا دینے مسکراہٹ کی فرد میں آ گئے۔  
 ”بتائیں نا آئی؟“ بیٹی نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ چونکی، پھر کہنے لگی۔

”غریب شہزادہ بہت خوبصورت ہے۔“  
 ”آپ نے دیکھا ہے؟“ فومی کا اشتیاق اسی طرح تھا۔  
 ”ہاں۔“

”کہاں۔؟“ فومی اور بیٹی ایک ساتھ بولے۔  
 ”اسی ہٹ میں۔“  
 ”ہمیں تو نظر نہیں آ رہا۔“ دونوں کاغذ پر جھک گئے تو سعد کے ہنسنے پر وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگی۔  
 ”اسی بی بی نے چاہا کہ وہی سے پلٹ جائیں لیکن پھر کچھ سوچ کر اندر چلی آئیں۔  
 ”کیا ہو رہا ہے تبھی؟“ یوں ظاہر کیا جیسے ابھی ابھی آئی ہوں۔

”شرہ آئی ڈرائنگ بنانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر ان کی ڈرائنگ۔۔۔ باا با۔۔۔ سعد اس کا مذاق اڑاتے ہوئے ہنسا تو آسیہ بی ٹو کہنے لگیں۔

”بڑی بات۔ بڑی بہن پر ہنستے ہو۔۔۔ چلو جاؤ پا پا کو اپنا ہوم ورک چیک کراؤ۔ فومی، بیٹی تم بھی ملو۔“  
 تینوں اپنے اپنے بیگ لے کر چلے گئے تو آسیہ بی ٹو شرہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

”بہت شرارتی ہیں تینوں، تمہیں تنگ کر رہے تھے؟“  
 ”نہیں آنٹی تنگ تو نہیں کر رہے تھے۔“

”پیار بھی بہت کرتے ہیں تم سے۔ اور تمہیں یاد بھی بہت کرتے ہیں۔ جب تم چلی جاتی ہو تو بہت دلوں تنگ آؤ اس رہتے ہیں۔“

”اچھا! میں بھی بہت مس کرتی ہوں۔ شرہ نے اُن کی بات کے جواب میں رسمی جملہ بولا اور وہ فوراً کہنے لگیں۔

”اب تو تم نہیں جاؤ گی نا۔ میرا مطلب ہے سکول کی تعلیم تو ختم ہو گئی۔ اب یہیں کالج میں ایڈمشن لے لو۔“

”نہیں آنٹی میں واپس جاؤں گی۔“  
 ”کیوں بیٹا۔ اپنے گھر کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ وہاں سب سے الگ تھلک۔“

”مجھے الگ تھلک رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔“  
 ”یہاں میں بہت ڈسٹرب ہو جاؤں گی۔ وہ فوراً بولی۔  
 ”اگر ایسی بات ہے تو ہم تمہیں الگ کمرادے دیں گے۔“

”پھر بھی نہیں۔ آرام سے بات کرتے کرتے وہ اکھڑنے لگی تو آسیہ بی خاموش ہو رہیں۔

پھر شاید شرہ نے پہلے سے انی جان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے انہیں اپنے حق میں ہموار کر لیا تھا۔  
 جبھی جیسے ہی اس کا رزلٹ آیا انی جان شیرازی سے کہنے لگیں کہ خود شرہ کے ساتھ مری جا کر اس کا کسی اچھے کالج میں ایڈمشن کرائیں۔ گو کہ شیرازی اس کے برعکس سوچے ہوئے تھے لیکن کیونکہ انی جان کی بات سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔ اس لیے پہلی فزٹ میں شرہ کے ساتھ چلے گئے۔ اس کا ایڈمشن اور بائٹل میں رہائش وغیرہ کا انتظام کر کے کوئی ہفتے بھر بعد واپس آئے تو آسیہ بی کہنے لگیں۔

”انسان کو کم از کم اپنی اولاد اور خاص کر بیٹی کے معاملے میں اتنا بے بس اور بے اختیار نہیں ہونا چاہیے۔“ شیرازی شاید کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے تھے اس لیے خاموشی سے اُن کی بات سن لی۔

کہنے بہت سارے دن گزر گئے۔ آسیہ بی بظاہر پُر سکون اور تینوں بچوں میں مصروف رہیں۔ لیکن اکثر سنی جیسے خود اُن کی خواہش پر جھیلنے ایٹ آباد بھیج دیا تھا وہ اور شرہ انہیں بے طرح یاد آتے۔ وہ



نے بھی اسی سکون سے سنا جب کہ تنہائی ملتے ہی کسی نے انہیں گھیر لیا۔  
"شیرازی! سچ بتائیں۔ کیا واقعی ٹرہ آپ ہی کی بیٹی ہے؟"

"ہمیں، اس میں کیا شک ہے؟ شیرازی کو ان کا سوال بڑا عجیب سا لگا تھا۔

"پھر آپ اس سے اتنے لا تعلق کیوں ہیں؟  
"کس نے کہا کہ میں اس سے لا تعلق ہوں؟"

"یہ لا تعلق نہیں تو اور کیا ہے کہ جوان جہان بیٹی بغیر اجازت لیے کسی دوست کے ساتھ چلی گئی ہے اور آپ اطمینان سے بیٹھے ہیں؟"

"جی، اس نے اطلاع دی تو ہے؟  
"محض اطلاع دی ہے۔ اجازت نہیں ملے ہے؟"

"ہو سکتا ہے، امی جان سے پوچھا ہو۔ میری تو اس سے بات ہوئی نہیں؟ شیرازی کا اطمینان بخود بڑھتا تھا۔

"پھر بھی اُسے آپ سے ضرور پوچھ لینا چاہیے تھا۔  
"آسیہ بیگم! شیرازی خاصے مطمئن بھرے پیچھے کہنے لگے۔

"اتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں ہمارے ساتھ رہتے ہوئے لیکن تمہاری سوچ اب بھی مڈل کلاس والی ہے؟  
"مجھے اپنے مڈل کلاس ہونے پر کبھی افسوس نہیں

رہا اور اتنا عرصہ کیا صدیاں بیت جاتیں تب بھی میں اپنی سوچ نہیں بدل سکتی۔ البتہ آپ لوگ ضرور ٹھوکر کھانے کے بعد؟"

"آسیہ! انہوں نے ٹوک دیا۔ جو کہنا ہے صاف کہو؟  
"میں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ لڑکیاں شیشے سے

زیادہ نازک ہوتی ہیں۔ چھو لینے سے میلے اور ہلکی سی ٹھٹھیس سے ہی ٹوٹ جاتی ہیں؟ کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگیں۔ اتنے اطمینان سے مت بیٹھیں شیرازی! کم از کم یہ تو معلوم کر لیں کہ وہ کس دوست کے ساتھ

جا رہی ہے؟  
"تم میری بیٹی پر شک کر رہی ہو؟ آسیہ بی نے

تاسف سے دیکھا اور دکھ سے بولیں۔  
"وہ میری بھی بیٹی ہے۔ میں اس کی ماں بن کر

سوچ رہی ہوں جیسی تو ایسا کہہ رہی ہوں ورنہ صاف لفظوں میں، مجھے کیا، کہہ کر بری الذمہ ہو جاتی۔ اب

جانتی تھیں ان دونوں بچوں کے ساتھ اچھا نہیں ہو رہا۔ بظاہر کتنی ہی اچھی تعلیم حاصل کر لیں کسی نہ کسی پہلو سے ضرور اور دوسرے رہ جائیں گے۔ سنی کے معاملے میں وہ مجبور تھیں

کیونکہ شیرازی کو زبردستی اسے پرانہ شفقت دینے پر مجبور نہیں کر سکتی تھیں لیکن خود اپنے بارے میں انہیں یقین تھا کہ انہوں نے ٹرہ کو — جہنم نہیں دیا اور پرورش بھی نہیں کی پھر بھی اندر سے ان کی مامتا

اس کے لیے بھی اسی طرح اُبلتی ہے جس طرح دوسرے بچوں کے لیے۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے کسی بیٹی کو جہنم نہیں دیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان کی اپنی بیٹی ہوتی تو وہ ٹرہ کی فکر سے آزاد ہو جاتیں لیکن اب

بہر حال ایسا نہیں تھا بلکہ وہ تو اب تک اس بات سے بھی سمجھوتا نہیں کر پائی تھیں وہ بھی کبھی تھیں کہ دوسرے بچوں کی طرح یہ بھی انہیں کی بیٹی ہے۔ اس پر اتنی مامتا بچاؤ کرنے کے بعد جب اس کے منہ سے آئی

سنیں تو اندر ہی اندر ہچکچا کر رہ جاتی تھیں۔ اور اب کی بار تو ٹرہ کے جانے سے وہ بہت ڈسٹر ب ہو گئی تھیں۔ کیونکہ وہ اگر بہت بڑی نہیں تھی تو چھوٹی بچی بھی نہیں رہی تھی۔ نو جوانی کی جس عمر میں وہ داخل ہوئی تھی اس میں بیٹیاں ماؤں کے سامنے

رہیں تب بھی واہموں میں مبتلا کرتی ہیں اور وہ تو دور تھی۔ آسیہ بی کی جگہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو شاید اس بات کو اتنی اہمیت نہ دیتی یا ہو سکتا

ہے وہ میری بلا سے، کہہ کر اپنے آپ کو بالکل بری الذمہ تصور کرتی لیکن آسیہ بی کی سرشت میں یہ شامل نہیں تھا۔ وہ تو شروع سے جو اپنے لیے چاہو وہی

دوسرے کے لیے پر ایمان رکھتی تھیں پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ سنی کے لیے کڑھتیں اور ٹرہ کے لیے نہیں۔ ٹرہ نے انٹر کر لیا تو گھر آنے کے بجائے فون پر

امی جان سے کہہ دیا کہ وہ اپنی کسی دوست کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہے۔ چھٹیاں وہیں گزارے گی

اور یقیناً اس نے ہمیشہ کی طرح امی جان کو اپنے حق میں ہموار کر لیا تھا۔ جیسی انہوں نے بہت سہولت سے آکر بتایا کہ ٹرہ چھٹیاں اسلام آباد میں گزارے

گی۔ اپنی کسی دوست کے ساتھ۔ امی جان نے جس طرح اس بات کو کوئی اہمیت دیے بغیر بتایا شیرازی

232



خدا کے لیے یہ مت کہہ دیجیے گا کہ مجھے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے بے ضرورت۔ میں کسی بھی طرح اپنے آپ کو اس کے بارے میں سوچنے سے باز نہیں رکھ سکتی، کیونکہ اول روز ہی میں نے اسے اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ اپنی مامتا میں سنی کے ساتھ اسے حقے دار بنایا تھا۔ آپ لاکھ اسے مجھ سے دور رکھیں، نظروں سے اوجھل کر دیں، دل میں وہ ہر وقت رہتی ہے۔ شیرازی کچھ نہیں بولے خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔ دل ہی دل میں متاثر ہوئے بھی تو ظاہر نہیں کیا اور آسیہ بی انتہائی مایوسی کے عالم میں اُن کے پاس سے اٹھ گئیں۔ لیکن اگلے روز جب شیرازی نے کلینک سے فون کر کے بتایا کہ وہ اسی وقت مٹھہ کو لینے جا رہے ہیں تب انہیں اطمینان کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اور وہ اس وقت سے مٹھہ کے لیے الگ کمر اٹھیک ٹھاک کر کے نے میں لگ گئیں۔

”کوئی جہان آ رہا ہے کیا؟“ اتنی جان پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں۔

”نہیں مٹھہ آ رہی ہے“ آسیہ بی نے خوشی سے بتایا۔

”کس نے کہا۔؟“

”شیرازی خود اسے لینے گئے ہیں“

”کب۔ مجھ سے تو ذکر نہیں کیا اُس نے؟“ اتنی جان کو خاصا ناگوار گزارا تھا کہ ان کے علم میں لائے بغیر وہ چلے گئے تھے۔

”ابھی اُن کا فون آیا تھا“ پھر آسیہ بی وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”اصل میں دو بجے کی فلائیٹ سے انہیں سیٹ مل گئی ہے۔ گھر آنے کا وقت نہیں تھا اس لیے وہیں سے چلے گئے۔“

”اچھا؟“ اتنی جان کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگیں۔

”لیکن رات تو میں نے بتایا تھا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ اسلام آباد جائے گی۔“

”جی؟“ آسیہ بی اسی قدر کہہ سکیں۔

”پھر شیرازی نے اسے لانے کا پروگرام کب بنا لیا؟“ اتنی جان مسلسل انہیں ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھے تو خود انہوں نے

ابھی صرف اپنے جانے کا بتایا ہے۔“ آسیہ بی اس وقت کوئی بد مزگی نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے ایسی بات کی۔ ورنہ اتنا اندازہ تو انہیں ہو گیا تھا کہ ان کی رات کی باتوں کو سنجیدگی سے سوچنے کے بعد ہی شیرازی گئے ہوں گے۔

شیرازی نے واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر بھی آسیہ بی کا خیال تھا کہ وہ کل تک واپس آجائیں گے کیونکہ وہ کسی تیاری سے نہیں گئے تھے۔ پھر صرف مٹھہ ہی کو تو لانا تھا۔ لیکن اگلے روز تو کیا پورا ہفتہ گزر گیا وہ نہ آئے اور نہ ہی فون کیا۔ یہ یقیناً تشویش کی بات تھی کم از کم فون تو کر دیتے۔ لیکن وہ تباہی کس کام میں کچھ گئے تھے کہ فون تک نہیں کیا۔ آسیہ بی مختلف دواہموں میں گھرتی رہیں۔ پریشان ہوتی رہیں صبح شام اتنی جان سے پوچھتیں شیرازی کا فون تو نہیں آیا۔ جواب میں اتنی جان نفی میں سر ہلاتے ہوئے جاتے کہ سوچوں میں گم ہو جاتیں کہ آسیہ بی مزید کچھ کہہ ہی نہ سکتی تھیں۔ اتنی جان لاکھ چھپاتیں پھر بھی وہ محسوس کر رہی تھیں کہ وہ خاصی پریشان سی ہیں۔ اور آسیہ بی کے خیال میں اُن کی پریشانی کا سبب بھی یہی ہے کہ شیرازی نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ پھر کوئی پندرہ بیس روز کے بعد شیرازی آئے وہ بھی اکیلے۔ مٹھہ اُن کے ساتھ نہیں تھی۔ اور فوری طور پر آسیہ بی کو مٹھہ کا خیال آیا بھی نہیں۔ اُن کے شکے تنکے وجود کو دیکھ کر پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہوں۔“ انہوں نے بیڈ پر نیم دراز ہو کر کہیں سے سہارا لے لیا۔

”اتنے دن کہاں رہے؟“ کوئی فون بھی نہیں کیا۔

”اتنی جان کو فون کیا تھا؟“ انہوں نے کہا تو آسیہ بی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

”لیکن انہوں نے تو مجھے نہیں بتایا۔“

”بھول گئی ہوں گی۔“

”بھول گئی ہوں گی۔ میں خود صبح شام اُن سے پوچھتی رہی لیکن۔“

”آسیہ؟“ انہوں نے ٹوک دیا۔ یہ ساری باتیں یا شکایتیں بعد کے لیے اسٹار کو۔ ابھی میں تھکا ہوا



آیا ہوں؟

آسیہ بی ایک دم خاموش ہو گئیں پھر خود بھی احساس ہوا کہ اتنے ہی جرح کرنے لگیں۔ اور غلطی کا احساس ہوتے ہی نادام ہو کر پو لیں۔

”آپ کے لیے چائے لاؤں؟“

”ہاں۔“ انہوں نے گہری سانس لی تو آسیہ بی فوراً کمرے سے نکل گئیں۔ کچھ دیر بعد چائے لے کر آئیں تو شیرازی آنکھوں پر بازو رکھے لیٹے تھے۔ وہ رک کر دیکھنے لگیں کہ کہیں سو تو نہیں گئے پھر ہلکے سے آواز دی۔

”شیرازی! انہوں نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا اور اُن کے ہاتھ میں چائے کا کپ دیکھ کر اُٹھ بیٹھے۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ کپ انہیں مٹھا کر خود بھی اُن کے پاس بیٹھ گئیں۔

”ہاں بس میرا خیال ہے آب و ہوا کی تبدیلی کا اثر ہے۔“

”کوئی دوا لے لیں۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سکون کی نیند لے لوں گا تو فریش ہو جاؤں گا۔“ انہوں نے دو تین گھنٹے میں چلے گا کپ خالی کر دیا اور انہیں ہمتا تے ہوئے کہنے لگے۔ ”میں سونا چاہتا ہوں۔ نیچے اکول سے آئیں تو خیال رکھنا مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“ وہ مڑلاتے ہوئے کُن کے پاس سے اُٹھ آئیں دروازے تک آ کر اچانک خیال آیا تو رُک کر پوچھنے لگیں۔

”شرہ آپ کے ساتھ نہیں آئی؟“

”نہیں، وہ ابھی وہیں رہے گی۔“ آسیہ بی پوچھنا چاہتی تھیں کہاں، لیکن انہوں نے اپنی بات کہہ کر کروٹ بدل لی تھی۔

پھر آسیہ نے غسوس کیا وہ جب بھی شرہ کا ذکر کرتی تھی شیرازی درمیان میں سے کوئی اور موضوع نکال لیتے تھے۔ پہلے انہوں نے اتفاق سمجھا پھر انہیں اچھنبا ہوا تو ایک دن باقاعدہ انہیں گھیر لیا۔ آخر آپ شرہ سے اتنے لاپرواہ کیوں ہیں۔؟

”کیا مطلب ہے؟“

”اس کا رزلٹ آنے میں بس ایک دو ہفتے ہی ہوں

گئے۔ اتنے وقت کے لیے اسے یہاں کیوں نہیں بلاتے؟“ یہاں آ کے کیا کرے گی؟ وہ بولے جیسے وہاں بڑے ضروری کام کر رہی ہو۔

”کمال ہے، یہ اس کا گھر ہے۔ سعد وغیرہ روز اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔“

”وہاں بھی وہ اپنے گھر میں ہے۔“

”اپنے گھر میں؟ آسیہ بی بالکل نہیں سمجھیں۔“

”ہاں۔ میں اس کی شادی کر آیا ہوں۔“ شیرازی نے اطمینان سے انہیں حیرتوں کے سمندر میں دھکیل دیا جس سے نکلنے میں انہیں خاصی دیر لگی اور جب نکلیں تب بھی یقین نہیں آیا۔

”وہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میرا مطلب ہے یہ کیسے ممکن ہے؟“

”کیوں۔ کیا اس کی شادی ناممکنات میں سے تھی؟“ ”نہیں۔ میں۔۔۔ یہ نہیں کہہ رہی۔ اور آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟ آسیہ بی اُلجھ کر تقریباً چیخیں۔

”آرام سے آسیہ بیگم! آرام سے۔ آؤ یہاں بیٹھ کر میری بات سنو۔“ آسیہ بی اسی طرح کھڑی رہیں تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھایا پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے۔

”شرہ نے کہا تھا کہ وہ اپنی کسی دوست کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہے چھٹیاں اس کے ساتھ گزارے گی۔ جب میں اسے لینے پہنچا تو وہ اپنی کسی کلاس فیلو یا کالج فیلو کے ساتھ نہیں بلکہ حماد گیلانی کے ساتھ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔“

”کون حماد گیلانی؟ آسیہ بی پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں۔“

”میں نہیں جانتا۔ لیکن شرہ اور وہ ایک دوسرے کو گزشتہ دو سالوں سے جانتے ہیں۔ اور دونوں شادی کا فیصلہ کر کے اس وقت اس پر عمل کرنے جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر شرہ سٹیٹائی ضرور لیکن اس کی میٹھ پر کیونکہ حماد کا ہاتھ تھا۔ اس لیے زیادہ پریشا نہیں ہوئی اور میرے استفسار پر اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ حماد سے شادی کرنے جا رہی ہے۔“

”پھر۔۔۔؟ وہ سانس لینے کو رُکے تھے کہ آسیہ بی



بے تابی سے پوچھنے لگیں۔

”پھر ظاہر ہے میں نے اس سے یہی کہا کہ تمہاری حاد سے شادی ضرور کروں گا لیکن اس وقت تم میرے ساتھ چلو۔ پہلے حماد اپنے والدین کو بھیجے باقاعدہ بات لے ہو پھر شادی ہوگی لیکن وہ اور حماد دونوں اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ یعنی دونوں اسی وقت شادی کرنے پر عہد تھے۔ پھر میں بڑی مشکل سے مٹرہ کو سمجھا کہ ہوٹل لے گیا، وہ بھی اس شرط پر میرے ساتھ جانے پر آمادہ ہوئی تھی کہ میں ان کی فوری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔“

شیرازی اچانک افسردہ نظر آنے لگے تھے۔ اور آسیہ بی سے نظریں بھی نہیں پا رہے تھے جیسے انہیں یقین ہو کہ ابھی وہ کہہ دیں گی، دیکھا مجھ سے دور رکھنے کا کیا نتیجہ نکلا۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولیں۔ بس خاموشی سے انہیں دیکھے جا رہے تھے جو سر جھکانے کہہ رہے تھے۔

”پہلے میں نے مٹرہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ کچھ بھی سننے پر آمادہ نہیں ہوئی تو میں اس کے علم میں لائے بغیر حماد گیلانی کے پاس گیا اور اسے اس شادی سے باز رکھنے کا ہر حربہ استعمال کر ڈالا لیکن سب بے سود۔ اگلا وہ مجھے دھمکی دینے لگا کہ آپ اگر اتفاق سے آہی گئے ہیں تو بہتر ہے اپنے ہاتھوں ہماری شادی کر دیں ورنہ ہم کورٹ میں جا کر کر لیں گے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”اس رات میں نے فون پر امی جان سے بات کی اور اس ساری صورت حال کے پیش نظر انہوں نے کہا کہ بہتر یہی ہے فوراً دونوں کی شادی کر دو۔ اس طرح کچھ بات رہ جائے گی ورنہ ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔ یوں مٹرہ کو حماد گیلانی کے ساتھ رخصت کر کے میں یہاں چلا آیا۔“

انہوں نے بات ختم کی تب بھی سر جھکانے بیٹھے رہے شاید آسیہ بی کی طرف سے طعنوں کے منتظر تھے اور یقیناً آسیہ بی کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو ان کا کلیجہ چیلنی کر دیتی لیکن آسیہ بی کی سرشت میں یہ سب شامل نہیں تھا۔ ساری بات سن کر اس طرح گم صدمہ بیٹھی رہیں البتہ اشکوں کا سیل رواں پلوں کا بندھن

چمکا تھا۔ کافی دیر بعد شیرازی نے سر اٹھایا اور انہیں روتے دیکھ کر حیران ہوئے۔

”تم رورہی ہو۔؟“

”کیا اب بھی نہ روؤں، میری بیٹی کو میرے علم میں لائے بغیر رخصت کر دیا۔ آنسوؤں کی روانی کے سبب وہ بمشکل بول پائیں۔“

”میں کیا کرتا، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے لیکن آپ مجھے بتا تو سکتے تھے جس طرح امی جان کو بتایا۔ یہاں آئے ہوئے بھی آپ کو دو مہینے ہو گئے ہیں تب بھی خود سے ذکر نہیں کیا۔“

پھر ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے کہنے لگیں۔

”آپ کے نزدیکی میری کوئی اہمیت نہیں اور خاص طور سے مٹرہ کے معاملے میں تو مجھے یوں الگ قلم رکھتے ہیں جیسے میں اس گھر کی فردہی نہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“

”بس کر یہ شیرازی، اگر سو تیلی ماں بھی سمجھا ہوتا۔“

تب بھی اتنا بے خبر نہ رکھتے۔ وہ سچ مجھ خفا ہو کر اٹھ گئیں اور شیرازی بے حد ندامت محسوس کرتے ہوئے سوچنے لگے۔

”کیا نام دوں اس عورت کو جو اس مقام پر مجھے الزام دیتے ہوئے ملامت بھی کر سکتی تھی۔ لیکن نہ کوئی الزام نہ کوئی ملامت بلکہ اس کی خفگی کا سبب ہی کچھ اور ہے۔“

اور اس مقام پر شیرازی کو احساس ہو رہا تھا

کہ انہوں نے آسیہ بی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ کاشی

وہ اول روز ہی مٹرہ کو ان کی گود میں ڈال دیتے

تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ آسیہ بی کی اہمیت اور اعلا

ظرفی کا اندازہ ہوتے ہی جہاں دل میں ان کی قدرو

منزلت بڑھی وہاں وہ گزشتہ رویے کی تلافی کا بھی

سوچنے لگے تھے لیکن کتنے بہت سارے دن گزر

گئے آسیہ بی اسی طرح خفا رہیں۔ جب تک وہ گھر

میں ہوتے تھیں میں یا بچوں کے ساتھ مصروف رہتیں

کسی وقت اچانک سامنا ہو جاتا تو کترا کر نکل

جاتیں۔

”بھئی، ایسا کب تک چلے گا؟ اس وقت وہ بچوں کے کمرے میں بیٹھیں بیٹی کو ہوم ورک کروا رہی تھیں



جب شیرازی وہیں چلے آئے اور اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھنے لگے۔ وہ خاموش رہیں بچے سے کہتے لگے۔

”دیکھو نیٹی! تمہاری امی مجھ سے بات نہیں کر رہی ہیں“

”پلیز شیرازی! بچے کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کریں۔“ آسیہ بی نے خفگی سے دیکھتے ہوئے ٹوکا۔ ”چلو بچی، امی کوئی پروکار ٹون آرہا ہے۔ نومی کے ساتھ جا کر دیکھو۔“ کارٹون کا نام سنتے ہی بیٹی کتابیں وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا تو وہ تکیہ کھینچ کر یوں لیٹے۔ ”آسیہ بی کا جھکا ہوا چہرہ انگاہوں کی زد میں آ گیا۔ ”ہاں بھئی، اب تباؤ۔ یہ خفگی کب تک چلے گی؟“ ”میں کون ہوں، ہوں آپ سے خفا ہونے والی؟“ آسیہ بی روٹے لہجے میں بولیں۔

”تم ہی تو سب کچھ ہو۔“ شیرازی نے محبت کا انداز اپنایا۔ ”نہیں۔“ وہ سختی سے کہہ کر پیچھے ہٹیں اور بیڈ کی بیک سے کمر نکالی۔

”تمہاری خفگی بجا ہے۔“ وہ پُر سوچ انداز میں کہنے لگے، ”شرہ کے معاملے میں ہم نے واقعی تمہیں انگ تھلگ رکھا، لیکن یقین کر واس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔ اصل میں، میں گھر لیو جھگڑاؤں میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے امی جان جو کہتیں، میں مان لیتا۔“

”اور میرے کہے کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔“ ”سختی۔ یقیناً سختی لیکن میں کیا کرتا۔ امی جان کو خفا نہیں کر سکتا تھا۔“ آسیہ بی نے شاکی نظروں سے دیکھا تو کہنے لگے۔ ”مجھے تمہاری خفگی کا بھی خیال رہا لیکن ساتھ ہی یہ یقین بھی کہ تم زیادہ دیر خفا نہیں رہو گی جلد مان جاؤ گی۔“

”اچھا! وہ استہزاء انداز میں نہیں۔“ صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو میری ناراضگی کی کبھی پروا نہیں رہی۔“

”ایسی بات نہیں ہے اس آؤہ فوراً بولے۔ پھر کیونکہ فوری مصالحت چاہتے تھے۔ اس لیے نظروں اور لہجے میں شرارت سمو کر کہنے لگے۔ ”چھوڑو یارا!

جو روٹھنے اور منانے کی عمر تھی۔ وہ تو تم نے یونہی گزار دی اور اب میں اتنے آپ کو بہت اناڑی محسوس کر رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آ رہا تمہیں کس چیز کی آفر کروں؟ وہ سوچتے ہوئے بولے۔

”آؤ شکریہ کھاؤ گی؟“ آسیہ بی، مشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگیں۔

”اچھا تم ہی تباؤ۔ کیا چاہیے؟“ ”جو مجھے چاہیے، وہ آپ دینے کی استطاعت رکھتے ہوئے بھی نہیں دیں گے۔“ آسیہ بی بیڈ سے اترتے ہوئے بولیں اور جانے کو تھیں کہ انہوں نے کلائی تھام لی۔

”کیا چاہیے تمہیں؟“ اُن کے لہجے میں تجسس تھا۔ اور آسیہ بی نے سوچا شاید یہی موقع اچھا ہے بلکہ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

”الگ گھر۔“ ”الگ گھر۔“ انہوں نے متعجب ہو کر دہرایا۔ تو وہ کہنے لگیں۔

”میں شاید ایسی خواہش کبھی نہ کرتی لیکن اس گھر میں جس طرح مجھے نظر انداز کیا جاتا ہے اس سے میں ایسا سوچنے پر مجبور ہوئی ہوں۔ یقین کریں میں تو اب تک اپنی حیثیت کا یقین ہی نہیں کر پائی اور نہ یہ جان پائی کہ مجھے یہاں کس مقصد کے لایا گیا تھا۔“

”تمہیں میرے لیے لایا گیا ہے۔“ ”آپ کی ایسی باتیں مجھے سہارا نہیں دے سکتیں شاید آپ نے اور امی جان نے ہر مقام پر میری نفی کی ہے اب اگر میری ذات کا اعتراف ہے تو پہلے مجھے گھر دیں۔ یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ آپ کے تین بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگی ہوں۔“

”لیکن کیوں؟“ اُن کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش محسوس کر کے شیرازی نے انہیں اپنے سامنے بٹھا لیا۔

”اس لیے کہ آپ امی جان کی ہر جائزہ و ناجائزہ بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا شرہ کو بائٹل بیج دو آپ نے فوراً عمل کر ڈالا۔ پھر محسن سنی کی وجہ سے سعد کے لیے یہی حکم اور اگر میں



سنی کو اماں کے پاس نہ بھیج دیتی تو وہ ایک ایک کر کے میرے سب بچوں کو مجھ سے الگ کر دیتی۔ انہوں نے کہا مٹرہ کی فوٹا شادی کر دو آپ نے اس سے بھی اختلاف نہیں کیا اور اب مجھے لگتا ہے کسی دن وہ مجھے یہاں سے نکالنے کا حکم سنائیں گی اور آپ کھڑے کھڑے تین لفظ کہہ دیں گے۔

”نہیں آسیہ! ان کا لہجہ اگر کمزور نہیں تھا تو مضبوط بھی نہیں تھا۔ جیسی وہ اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے بولیں۔“

”آپ خواہ کچھ بھی کہیں۔ میں بہر حال یہاں نہیں رہنا چاہتی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں جب کہ شیرازی اس کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہے تھے اور جب وہاں سے اٹھے تو اپنے طور پر فیصلہ کر چکے تھے۔

بارگھاٹ مٹ جائے تو پھر کبھی کسی بات کی گنجائش نہیں رہتی۔ جب کہ اتنی جان گنجائش رکھنا چاہتی تھیں کیونکہ مقابل شیرازی نہیں آسیہ بی تھیں اور آسیہ بی کے بارے میں ان کے سوچنے کا انداز ہی الگ تھا۔ یعنی وہ مڈل کلاس عورت ہمارے جیتی تھی اور ان کے مقابلے میں وہ خود جیت کر باری تھیں اور اول روز سے اپنی بار جس طرح دل میں کانٹا بنی تھی۔ اس کی چھین اب بھی دل میں موجود تھی گو کہ یہ صرف ان کی اپنی سوچ تھی جیسے انہوں نے انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ اس لیے وہ آسیہ بی کو کسی بھی مقام پر سرخرو نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ بہر حال اس وقت انہوں نے شیرازی کو آسیہ بی کے حق میں بولتے دیکھ کر غلاموں رہنے ہی میں مصیبت سمجھی اور بس اتنا کہا۔

”جہاں رہو سکتی رہو۔“

اتنی جان کے لیے یہ خبر کسی ایٹم بم سے کم نہیں تھی کہ شیرازی الگ گھر خرید کر اب بیوی بچوں کے ساتھ اس میں شفٹ ہو رہے ہیں۔ تصدیق کے لیے شیرازی سے پوچھا تو انہوں نے اطمینان سے اعتراف کیا اور ان کا غیر متوقع اعتراف اتنی جان کو مزید طیش دلا گیا۔ پھر بھی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تو چھپنے لگیں۔

”یہاں کیا تکلیف ہے تمہیں؟“

”بات تکلیف کی نہیں ضرورت کی ہے۔ مجھے بڑے ہو رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ عہد و ماحول ان کے لیے سازگار نہیں ہے۔“

”صاف کیوں نہیں کہتے میاں کہ یہ بٹی تمہاری بیوی کی پڑھائی ہوئی ہے۔ آخر کو ہے ناں مڈل کلاس۔ اپنے نظریات کیسے بدک سکتی ہے۔“ اتنی جان کا رخ آسیہ بی کی طرف مڑ گیا۔ اور اس سے پہلے کہ براہ راست ان سے کچھ کہتیں شیرازی بول پڑے۔

”آسیہ کو الزام مت دیجیے اسے تو خود ابھی ابھی معلوم ہوا ہے۔“

اور اتنی جان جہاں ندیدہ خاتون تھیں جانتی تھیں کہ جب مرد اپنی بیوی کے حق میں بولنے لگے تو پھر باقی رشتوں کا لحاظ بھلا دیتا ہے۔ اور جب ایک

آسیہ بی خوشی سے الگ نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے نئے گھر اور اس کی سیاہ و سفید کی ملکیت نے ان پر شادی مرگ کی کیفیت طاری نہیں کی۔ البتہ تحفظ کے احساس نے طمانیت ضرور بخشی تھی۔ اور اب یہ خون بھی نہیں رہا تھا کہ اتنی جان کسی بھی وقت ان کے یا ان کی اولاد کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ سنا کر انہیں بے وقعت کر دیں گی۔ نئے گھر کی سنگت کرتے ہوئے انہوں نے خاص طور سے ایک کمر مٹرہ کے لیے مخصوص کیا۔ ان کا خیال تھا۔ مٹرہ کو یہاں آتے جاتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ لڑکیوں کا اگر میکے سے بالکل ناتا ٹوٹ جائے تو پھر سسرال میں بھی ان کی اہمیت و حیثیت تسلیم نہیں کی جاتی۔ اور آسیہ بی کو یہ گوارا نہیں تھا کہ مٹرہ کسی مقام پر بے وقعت ہو اور پھر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ وہ اس کی شادی اپنے ہاتھوں نہیں کر سکی۔ تھیں اس بات کا دکھ اپنی جگہ پھر بھی۔ وہ اسے میکے کا مان دینا چاہتی تھیں۔ جیسی جب نئے گھر میں روزمرہ کے معمولات میں باقاعدگی آئی تو وہ شیرازی سے کہنے لگیں۔

”مٹرہ کی شادی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ اس دوران وہ ایک مرتبہ بھی یہاں نہیں آئی۔ آپ اسے لکھیں یا فون کریں کہ کچھ دنوں کے لیے آجائے۔“

”میں اسے فون کر دوں گا پھر آگے حاد پر منحصر۔“



ہے کہ اسے بھیجتا ہے یا نہیں۔ حماد کے نام پر شیرازی کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی تھی۔

”کیوں کیا وہ منع کرے گا؟ شیرازی کے لیے میں بیزاری محسوس کرنے کے باوجود آسیہ بی بی سے بات وہیں ختم نہیں ہونے دی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ پتا نہیں کس مزاج کا ہے۔“

”خواہ کسی مزاج کا ہو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم اپنی بیٹی سے بالکل بے خبر اور لاپرواہ ہو جائیں۔ اول تو اسے خود مٹھہ کو یہاں لانا چاہیے تھا۔ یا پھر ہو سکتا ہے، وہ ہمارے بلاوے کا منتظر ہوئے آخر میں پُر سوچ انداز میں بولیں تو شیرازی ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہو۔“

”پھر آپ کب اسے فون کر رہے ہیں؟“

”جب تم کہو۔“

”میں تو کہوں گی، آج ہی۔“

”آج؟ شیرازی سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے فون کرنے کے بجائے ہم خود چلتے ہیں۔ تم حماد کے گھر کا ماحول اور حالات بھی دیکھ لینا تاکہ دل میں اکثر شبہات جو جنم لیتے ہیں ان سے چھٹکارا ملے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ کیونکہ میں بھی اکثر مٹھہ کے بارے میں سوچتے ہوئے پریشان ہو جاتی ہوں۔ خدا کرے وہ خوش ہو۔“

اب تک شیرازی قصداً آسیہ بی بی کے سامنے مٹھہ کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ شاید ان کے لاشعور میں یہ بات تھی کہ وہ کیونکہ مٹھہ کی ماں نہیں ہیں اس لیے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ گو کہ آسیہ بی بی ہر مقام پر اس کی ماں ہونے کا دعوہ کرتی آئی تھیں اور اگر مٹھہ شروع سے ان کے پاس رہتی تو وہ اپنے دعوے کو سچ کر دکھاتیں۔ بہر حال پہلے کیونکہ شیرازی پر۔

امتی جان کی گرفت مضبوط تھی۔ اس لیے آسیہ بی بی مٹھہ کے لیے محبت کا اظہار کرتیں مگر بھی تو وہ کوئی خاص توجہ نہیں دیتے تھے اور اب کیونکہ دل اور ذہن ایک طرح سے آزاد ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ دیر تک آسیہ بی

کے خلوس کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے گھر سے دوری کے سبب مٹھہ نے جو قدم اٹھایا تھا۔ اس سے بھی انہیں آسیہ بی کی اجمیت کا اندازہ ہو گیا تھا اور اب تو وہ ہر بات ان کے ساتھ شہید کرنے لگے تھے۔ ساتھ ہی شدت سے یہ ملال بھی ہوتا کہ جب بچی کے لیے ماں کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے دوسری شادی کی تھی تو پھر بچی کو اس سائے سے محروم کیوں رکھا۔

پھر ابھی وہ آسیہ بی کے ساتھ مٹھہ کے پاس اسلام آباد جانے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ امتی جان کا بلاوا آ گیا۔ وہ اسی وقت کلنگ سے لوٹے تھے۔ ابھی دریں بھی چہنچ نہی کیا تھا کہ امتی جان نے فون پر فوراً آنے کے لیے کہا۔ آسیہ بی کھانے کی ٹیبل لگا چکی تھیں یہاں بھی کھانا کھا کر جائیں لیکن وہ اسی طرح چلے گئے۔ پھر ان کی واپسی رات میں ہونی خاصے محلے ہوئے اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ اس لیے آسیہ بی نے فوراً کوئی بات نہیں پوچھی۔ بہت خاموشی سے انہیں کپڑے نکال کر دیے اور چائے بنانے چلی گئیں۔ اس دوران خود ہی ان کی پریشانی کا سبب سوچتی رہیں اور اسی طرح سوچتی ہوئی چائے لے کر انہیں تو شیرازی آنکھوں پر بازو رکھے لیٹے تھے۔

”چائے لے لیں شیرازی! انہوں نے پکار کر کہا تو وہ اٹھ بیٹھے اور کپ لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔

”امتی جان کے گھر سب خیریت تو ہے نا۔“ انہیں بولنے پر آمادہ نہ دیکھ کر خود ہی پوچھنے لگیں۔

”ہاں۔“ مختصر جواب اس کے بعد سوچتا ہوا اندازہ کیا کہوں، ظاہر کر رہا تھا۔ آسیہ بی خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔ تب وہ جیسے اپنے آپ سے بولے۔

”مٹھہ آئی ہے۔“

”مٹھہ آئی ہے؟“ آسیہ بی نے خوشی کا اظہار کیا۔ آپ اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟ حماد بھی ساتھ آیا ہے کیا؟

”یہ کپ لے لو۔“ آسیہ بی کی باتوں کے جواب میں



شیرازی نے ایک ہی ٹھونٹ میں چائے ختم کر کے غللی  
کپ ان کی طرف بڑھا دیا۔ جسے لے کر ٹیبل پر رکھتے  
ہوئے وہ بوجھنے لگیں۔  
”ابھی تو ٹھہر رہے گی ناں؟“

”ہاں، اب کہاں جانا ہے اسے۔ اب تو یہیں  
رہنا ہے۔“ شیرازی کا لہجہ عجیب سا اور آندروں کی آواز  
ہونے لگا کہ آسیہ بی چوٹک گئیں۔  
”کیا مطلب؟“

”حماد نے اسے طلاق دے دی ہے۔“  
”کیا۔؟“ شیرازی کی آواز جتنی دھیمی تھی آسیہ بی کی اتنی  
ہی اونچی تھی۔

”کیوں؟ میرا مطلب ہے کس لیے؟“  
”کیوں اور کس لیے؟ کیا سوال آسیہ بیگم! تم اچھی  
طرح جانتی ہو کہ ایسی شادیوں کا ایسا ہی انجام ہوا  
کر تا ہے۔“

”ہاں لیکن ضروری تو نہیں کہ ٹھہر کے ساتھ بھی  
ایسا ہو۔ کس وجہ سے؟ کیا چاہتا تھا وہ؟“  
”پتا نہیں ٹھہر کچھ بتانے پر آمادہ ہی نہیں۔ اپنے  
آپ کو کمرے میں بند کر لیا ہے اُس نے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ آسیہ تاسف سے بولیں۔  
”انہیں حقیقتاً بے حد دکھ ہوا تھا اور سمجھ میں بھی نہیں  
آ رہا تھا کہ شیرازی کو کس طرح سہارا دیں۔“  
”شاید اسی میں کوئی مصلحت ہو۔“ بس اتنا کہا اور  
خود رو پڑیں۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حماد کو اگر کوئی  
شکایت تھی تو ہم سے کہتا۔ ہم سمجھا دیتے، ابھی نیچی  
ہی تو ہے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور شیرازی

چپ چاپ انہیں دیکھتے گئے  
اگلے دن شیرازی کلینک کے لیے تیار ہوئے تو  
وہ ان کے پاس آکر کہنے لگیں۔

”شیرازی! میں ٹھہر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ آپ  
مجھے آماں جان کے گھر چھوڑ دیجیے گا۔“

”اس وقت؟“ شیرازی سوچتے ہوئے بولے۔  
”ہاں، میں فارغ ہوئی تو ہوں۔ بچوں کی اسکول سے  
واپسی تک آ جاؤں گی۔ انہوں نے اوکے کہا تو وہ جلدی  
سے لباس تبدیل کرتے چلی گئیں۔“

پھر جب وہ شیرازی کے ساتھ اتنی جان کے کمرے  
میں داخل ہوئیں تو ٹھہر وہیں موجود تھی شدت گریہ  
سے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر ان کا دلچسپ کٹ کر رہ  
گیا۔ بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھرنا چاہتی تھیں کہ وہ  
اُٹھ کر دور جا کر رہی ہوں۔

”بیٹی! اسی قدر کہتا تھا کہ وہ پہنچ پڑی۔“  
”مت کہیں مجھے بیٹی۔ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔“  
اگر شروع سے آپ نے مجھے بیٹی سمجھا ہوتا تو میں گھر  
سے بے گھر کیوں ہوتی؟

”ٹھہر! شیرازی کے تنہی لہجے کا اس پر کوئی اثر  
نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح چہینتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

”آپ ان کی طرف داری مت کیجیے یا پاپا! یہ تو کوئی  
ماں سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہیں۔ انہی کی بدولت  
وادی جان مجھے گھر سے دور بھیجنے پر مجبور ہوئیں۔ جہاں  
مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں تھا۔ اپنی من مانی  
کمرے میں رہی جس کا انجام دیکھ لیا آپ نے۔ اور  
آپ لوگوں کا کیا بگڑا زندگی میری برباد ہوئی اور یہ  
غصہ ان کی وجہ سے۔ آپ لے جاتے انہیں ہیں انہیں  
مزید برداشت نہیں کر سکتی۔“

”تم اپنی تمی پر غلط الزام رکھ رہی ہو۔ آسیہ بی  
کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھ کر شیرازی ان کی صفائی  
میں کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اتنی جان بول پڑیں۔

”شیرازی! تم دیکھ رہے ہو، یہی طبیعت ابھی  
ٹھیک نہیں ہے تم خواہ مخواہ اسے پریشان مت کرو۔“  
جاؤ بیٹی ٹھہر! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

ٹھہر پیر چنتی ہوئی چلی گئی اور آسیہ بی تو جانتی  
ہی تھیں شیرازی بھی جان گئے کہ ٹھہر کو ان سے  
منتفر کیا گیا ہے۔ پھر وہ وہاں رکے نہیں آسیہ بی کو لے  
کر چلے آئے۔

تمام راستہ آسیہ بی نہ صرف خاموش رہیں بلکہ  
آنسوؤں کو اندر ہی اندر انارکلی کو شش کرتی رہی  
تھیں۔ پتا نہیں کیوں وہ جتنی ٹھہر کی طرف کھینچتی تھیں  
وہ اتنی ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اور اسی تو  
وہ یہ سوچ کر آتی تھیں کہ اسے اپنے ساتھ لے آئیں  
گی لیکن اس نے بُری طرح انہیں دھتکار دیا تھا۔  
”کاش اس نے میری کوکھ سے جہم لیا ہوتا یا پھر



میرے اندر اس کے لیے اتنی محبت نہ جاتی۔ انہوں نے سوچا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترنا چاہتی تھیں کہ شیرازی کہنے لگے۔

”آسیر خفا ہو؟ آسیر بی بی نے نفی میں سر ہلادیا۔  
”اچھی بات ہے لیکن پلیر شرہ کی باتوں کو زیادہ مت سوچنا۔“

”مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں، اسے جوتایا گیا اس نے وہی کہا۔ وہ اتنی جان کو الزام دیے سے باز نہ رہ سکیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ اتنی جان اچھا نہیں کر رہی۔ بہر حال تم فکر مت کرو۔ اپنی بے لوث محبت پر یقین رکھو جو کبھی نہ کبھی شرہ کو تمہارے قریب ضرور لے آئے گی۔“

”خدا وہ دن جلد لائے۔ آسیر بی بی نے کہا اور گارٹی سے اتر کر اندر چلی گئیں۔“

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک دوپہر جب شیرازی کلینک سے لوٹے تو شرہ ان کے ساتھ تھی۔ بے حد سنجیدہ اور خاموش خاموش سی کچھ کمزور بھی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور رنگت سانولی ہو رہی تھی۔ دل کے باتوں مجبور ہو کر وہ پھر اس کی طرف بڑھنا چاہتی تھیں لیکن اس کا گزشتہ رویہ یاد کر کے وہیں لک گئیں۔  
”شرہ اب یہیں رہے گی ہمارے پاس۔“ شیرازی یہ خوشخبری سن کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ اس سے کہنے لگیں۔

”میں نے تمہارا کمرہ سیٹ کر رکھا ہے۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔“ وہ چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑی۔

اپنے کمرے کو دیکھ کر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بیڈ پر یوں گرمی جیسے بہت دور سے چلتی ہوئی آئی ہو۔

”کھانا کھاؤ گی؟ ان کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”بھوک نہیں ہے یا۔“

”نہیں، میں کھا کر آئی ہوں۔“

”اچھا پھر تم آرام کرو۔ میں تمہارے پاس ہوں۔“

بھائیوں کے لیے کھانا لگا دوں۔ آسیر بی بی اس کے کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم میں آئیں تو سعد کھانا لگا چکا تھا۔

”ارے؟ وہ منہ ہی کیسا زیادہ بھوک لگی ہے؟“

”ہاں اور اب آپ بیٹھیں۔ میں پاپا اور ٹونی، بیٹی کو بلالاتا ہوں۔ وہ عجلت میں کہتا ہوا چلا گیا۔ پھر کھانے کے بعد حسب عادت سب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو وہ شرہ کے پاس آگئیں۔ وہ سوئی نہیں تھی۔ چھت پر نظر میں جمائے جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ آہٹ پر یونی نظروں کا ناویہ بدل کر ان کی طرف دیکھا اور اٹھنے لگی تھی کہ انہوں نے روک دیا۔

”بیٹی رہو۔ نیند نہیں آرہی کیا؟“

”نہیں۔“

”پریشان سوچوں میں گھری ہوئی تو نیند کیسے آئے گی؟ شاید اسی لیے اتنی کمزور ہو رہی ہو۔“

”نہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“  
”کیا ہوا ہے؟“ وہ پریشانی سے بولیں۔ تمہارے پاپا سے تمہوں کہ۔“

”نہیں اتنی؟“ وہ فوراً بول پڑی۔ پاپا سے کچھ نہ کہیں۔“

”کیوں۔“

”میں کسی گمان کو لو جسٹ کے پاس جاؤں گی۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے آہستہ آواز میں بولی۔

”ارے کیا تم ماں بننے والی ہو؟ آسیر بی بی حیرت و خوشی کا ملا جلا اظہار کرتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھیں۔

”جی۔“

”یہ تو اچھی خبر ہے پھر تم اتنی رنجیدہ کیوں ہو؟“ اور وہ تکیے میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

”ارے رے رو نہیں بیٹا؟ آسیر بی بی پریشان ہو گئیں اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ لیکن وہ چل کر اٹھ بیٹھی اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

”کیا آپ بھی مجھ سے یہی کہیں گی کہ میں اس بچے



سے نجات حاصل کر لوں؟“  
 ”نہیں۔ کون کہتا ہے ایسا کرنے کو؟“ آسیہ بی  
 بے حد حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔

”دادی جان۔ وہ میری کوکھ اُجاڑنا چاہتی ہیں  
 اس لیے میں یہاں چلی آئی ہوں لیکن آپ سن لیں  
 اگر آپ نے ایسی کوئی بات کی تو میں یہاں سے  
 بھی چلی جاؤں گی۔“ وہ پھر اکھڑنے لگی تو آسیہ بی اس  
 کے ہاتھ تھیک کر نہی سے بولیں۔

”میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گی بیٹا لیکن  
 مجھے بتاؤ۔ تمہاری دادی جان ایسا کیوں چاہتی ہیں۔“  
 ”اُن کا کہنا ہے کہ جب حماد سے کوئی تعلق نہیں  
 رہا تو مجھے اس کے بچے کی ماں بھی نہیں بننا چاہیے  
 اور وہ میرے آئندہ کے بارے میں سوچتے ہوئے  
 بچے کو میرے پاؤں کی زنجیر اور راہ کی رکاوٹ کہتی  
 ہیں۔“ پھر خود ہی کہنے لگی۔ ”ایک طرح سے وہ ٹھیک  
 کہتی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ بچے کے  
 لیے ماں اور باپ دونوں کا ہونا کس قدر ضروری  
 ہے۔ جس کی ماں نہ ہو وہ شمرہ اور باپ نہ ہو تو  
 سنی۔“

”سنی! آسیہ بی کے اندر ہلکا ہلکا درد کر وٹیں  
 لینے لگا۔ اور وہ کہہ رہی تھی۔

”اس کے باوجود میں ایسا نہیں کروں گی میں  
 اپنی مامتا پر ظلم نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا کر سکتی تو اپنا  
 گھر نہ بچا لیتی۔ جیسا کہ حماد چاہتا تھا؟“  
 ”کیا چاہتا تھا حماد؟“ آسیہ بی چونک کر پوچھنے  
 لگیں۔

”یہی کہ میں ماں نہ بنوں۔“

”کیوں؟“

”کیوں؟“ وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر کہنے لگی۔

”اصل میں حماد پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کا  
 باپ تھا۔ لیکن مجھ سے اس نے اپنی حقیقت پوشیدہ  
 رکھی تھی۔ جب مجھے معلوم ہوا تو فطری بات ہے کہ میں  
 چیخی چلائی اور خفا ہوئی لیکن پھر مجھے سمجھنا کرنا پڑا۔  
 کیونکہ جس طرح اپنی من مانی کر کے ہونے میں نے  
 شادی کی تھی اس کے پیش نظر میرے لیے واپس کا

کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اگر  
 وہ پہلی بیوی کے ساتھ میرے حقوق بھی پورے کرتا  
 رہے تو زندگی کسی نہ کسی طرح گزر رہی جائے گی۔  
 قدر سے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”پھر جب مجھے اپنے وجود کے اندر ایک نئے وجود  
 کا احساس ہوا تو میں نے سوچا تھا کہ اب میری حیثیت  
 اپنی جگہ مستحکم ہو جائے گی لیکن جب حماد کو معلوم  
 ہوا تو وہ بھرپور اٹھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ  
 کہ اسے مجھ سے اولاد کی خواہش نہیں ہے۔ اولاد  
 تو اس کے پاس پہلے سے موجود ہے اور یہ کہ میں  
 فوری طور پر اس سے چھٹکارا حاصل کر لوں لیکن  
 میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی۔“

وہ خاموش ہو گئی اور دوپٹے کے پلو سے اپنی  
 گیلی آنکھیں صاف کرنے لگی۔ آسیہ بی کے پاس کہنے  
 کو اور اسے سمجھانے کو بہت کچھ تھا لیکن اب جب  
 کہ کچی عمر، کچے ذہن کی بدولت وہ سارے ناتے  
 توڑ آئی تھی تو کچھ بھی کہنا بے کار تھا اس لیے وہ خاموش  
 ہی رہی اور کچھ دیر بعد وہ کہنے لگی۔

”میرے ساتھ شروع ہی سے اچھا نہیں ہوا۔  
 جی کی ڈیوٹی کے بعد پانچ ایک سال بھی پورا نہیں  
 کیا اور دوسری شادی کر لی۔ آپ تو ماں تھیں اگر  
 اپنے بیٹے ہی کا خیال کر کے مجھے اپنی مامتا کے سامنے  
 میں لے لیتی تو میں یوں حالات کا شکار نہ ہوتی۔  
 لیکن آپ نے اپنے بیٹے کو خود سے جدا کرنا منظور کر  
 لیا۔ میرے سر پہ ہاتھ نہ رکھا۔“

وہ بیڑے دھڑلے سے اپنی تباہی کا ذمہ دار نہیں  
 ٹھہرا رہی تھی۔ آسیہ بی سننے میں آگئیں۔ کافی دیر  
 بعد اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کر سکیں تو کہنے لگیں۔  
 ”تمہارا قصور نہیں ہے بیٹا! ایک تو تم گھر سے دور  
 رہی اور دوسرے تمہیں میرے بارے میں جو کچھ کہا

گیا۔ تم نے اسی کا یقین کیا۔ کبھی خود سے سوچو اور دیکھو  
 کہ میں نے کیا کیا تمہارے ساتھ کیا کرنا جان سکو تو اپنے  
 پاپا سے پوچھنا کہ تمہارے لیے میرے کیا احساسات تھے  
 اور ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی آسیہ بی اس کے پاس سے اٹھ



کر آگئیں۔

چہرے سے پھسلتی ہوئی بیماری جو توں پر جا بڑھ رہی تھی۔  
”بیٹھنے کو نہیں کہیں گی؟ وہ اسے خاموشی دیکھ کر بولا۔“

”ہاں بیٹھو۔ میرا مطلب ہے بیٹھیں۔“ وہ کنفیوز ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا اس سے کس طرح بات کرے۔  
”تھینک یو۔“ وہ کہہ کر بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھ کر۔  
”پوچھنے لگا۔ تمی کہاں ہیں؟“  
”وہ اور پاپا کہیں ڈنر پر گئے ہیں۔“  
”اور سعد وغیرہ؟“

”تینوں بھائی کو چنگ سینٹر گئے ہیں۔“  
”اچھا؟ وہ یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر اس پر نظریں پھریں تو پورے سر آپے میں اٹھنے لگیں۔  
”آپ تو عائشہ مری میں ہوتی ہیں ناں؟ اسے جز بڑے ہوتے دیکھ کر بات کرنے کی غرض سے بولا۔  
”تمی نے مجھے آپ کی شادی کے بارے میں لکھا تھا۔ کیا کرتے ہیں آپ کے مہند؟“

”میں اب مری میں نہیں رہتی ہوں۔“ اس کی بات کے جواب میں بس اسی قدر کہا۔  
”اچھا۔ کب شفٹ ہوئیں کہاں؟“  
”چھ ماہ ہو گئے ہیں۔“

”چھ ماہ؟“ وہ حیرت کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ ”تمی نے آپ کی یہاں شفٹنگ کے بارے میں مجھے نہیں لکھا۔“  
”کیا ضروری ہے تمہیں یہاں کی ہر بات تکھی جائے؟“ وہ ناگواری سے بولی۔

”ہو سکتا ہے آپ اسے ضروری نہ سمجھتی ہوں لیکن لیکن میں اس گھر سے باخبر رہنا ضروری خیال کرتا ہوں۔“  
وہ اس کی ناگواری محسوس کر کے سنجیدگی سے بولا۔

”اچھی بات ہے۔ ضرور اس گھر سے باخبر رہو لیکن میری ذات سے نہیں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”شاید آپ کو میری کوئی بات ناگوار گزری ہے؟“ وہ افسردہ نظر آنے لگا اور وہ کوئی جواب دیے بغیر اندر چلی گئی۔

”ویسی ہی سنگدل جیسی کہ ہوا کرتی تھی؟“ اس نے سوچا اور دو بارہ کہہ کر بیٹھا تو اس کی پہلی ہیبت

انہیں ہمیشہ ایسی باتوں سے دکھ ہوتا تھا۔ اب بھی وہ اگلے کئی دن تک اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔  
اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مٹھہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ہمیشہ اتنی جان کی کہی باتوں پر یقین کیوں کر لیتی ہے۔ اور اب تک تو وہ اسے سچی سمجھ کر اس کی باتوں کو نظر انداز کرتی آئی تھیں لیکن اب جب کہ وہ بچے کی ماں بننے والی تھی تو اُن کا خیال تھا اسے اتنی عقل ضرور آجانی چاہیے کہ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکے۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ ایک ماں جس طرح ایسے دنوں میں اپنی بیٹی کا خیال رکھتی ہے اسی طرح اس کا خیال رکھ رہی تھیں لیکن خود کو منوانے کی کوشش انہوں نے ترک کر دی تھی۔

برآمدے اور اس سے آگے لان میں تاریکی دیکھ کر مٹھہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ ٹیوب لائٹس اُن کیں پھرو ہیں برآمدے میں بیٹھ گئی، اُن دنوں وہ پورے دنوں سے تھی، گوکہ ڈاکٹر نے جمل قدری کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ چند قدم میں ہی تھک جاتی۔ اب بھی اپنے کمرے سے لنگی تو برآمدے میں بیٹھ گئی۔ ذہن — مختلف اور پریشان خیالات کی آماجگاہ تو بنا ہی رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے حالات کو سوچنے میں اس قدر محو تھی کہ گیٹ کھلنے اور کسی کے آنے کی خبر ہی نہ ہوتی۔ گوکہ آنے والا اپنے جو توں کی آواز پیدا کرتا ہوا آیا تھا۔ ”ایکسیکونڈی! اس آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔ فل یونیفارم میں تپا نہیں کون تھا۔ جس کی آنکھیں ایک پل میں پہچان کی منزلیں طے کرتے ہوئے چمکنے لگی تھیں۔“

”آپ مٹھہ ہیں ناں؟“ اس کے دیکھنے پر وہ استیقا سے پوچھنے لگا۔

”جی اور آپ؟“  
”سنی۔ کمیشن سکندر بخت۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے سیوٹ مارا تو اس کی نظریں یونہی اس کے



ساری باتیں یاد آنے لگیں۔  
”تم میرے بھائی نہیں ہو۔ میں تمہیں نہیں پہچانوں۔“

”جی۔“ میں تمہاری باجی نہیں ہوں مجھے شرہ بی بی کہو۔  
”شرہ بی بی! وہ بچے سے بڑا بڑا اور سرکشی کی  
بیک سے نکالیا ہی۔ ستارہ گیٹ سے گاڑی داخل  
ہوتے دیکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ گاڑی سے اتر کر  
شیرازی اور آسیہ بی بی اس طرف آئے تو وہ کھڑا ہو گیا  
اور آسیہ بی بی کے اشارے پر پہلے شیرازی سے گلے ملا  
پھر کسی معصوم بچے کی طرح ان کی آغوش میں سما گیا۔  
”کب آئے۔؟“

ابھی کچھ دیر ہوئی۔  
”کیسے ہو؟“ شیرازی کا وہی عام سا انداز تھا۔ نہ  
سرد مہتری اور نہ گرم جوشی۔  
”دعائیں ہیں آپ کی؟“ وہ شیرازی کے سامنے  
موڈب کھڑا ہوا۔

”سعد وغیرہ سے ملے۔ آؤ اندر آ جاؤ لیہاں کیوں  
کھڑے ہو؟“ آسیہ بی بی اس سے باتیں کرتی ہوئی۔ سعد  
کے کمرے میں آگئیں۔  
”آرام سے بیٹھو، میں پہلے تمہارے لیے چائے  
لے آؤں۔“

”رہنے دیں مٹی۔ آپ ابھی تو آئی ہیں۔“  
”تو کیا ہوا۔ یہ بتاؤ، پہلے کھانا کھاؤ گے یا؟“  
”آپ تو غالباً دُور سے آرہی ہیں؟“ وہ اُن کی  
بات کاٹ کر بولا۔

”ہاں لیکن تمہیں کس نے بتایا؟“  
”شرہ نے۔“

”شرہ سے ملاقات ہوئی تمہاری؟“  
”جی۔ جب میں آیا وہ برآمدے میں بیٹھی تھیں۔“  
پھر قصداً اس کے ذکر سے اجتناب برت گیا۔ ”سعد  
وغیرہ کب آئیں گے سب ٹھیک تو ہیں ناں؟“  
”ہاں بس ابھی آتے ہوں گے۔ سب تمہیں بہت  
یاد کرتے ہیں۔“

”کیا کر رہا ہے سعد، میرا مطلب ہے کون سی کلاس  
میں ہے۔“

”انٹر میں ہے۔ دعا کرو پوزیشن کے آگے۔“  
”قابل باپ کا بیٹا ہے۔ پوزیشن ضرور لائے گا۔“  
اس نے سادگی سے بہت عام سی بات کہی پھر بھی  
آسیہ بی بی نے نظروں کا زانو یہ بدل لیا اور۔ فرار کی خاطر  
اُٹھتے ہوئے بولیں۔

”تم بیٹھو۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔ سب بھائی مل  
کر کھا لیتا۔ البتہ چائے میں تمہارے ساتھ پیوں گی؟“  
اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو آسیہ بی بی کمرے  
سے نکل گئیں۔

اپنے کمرے میں آئیں تو شیرازی لباس تبدیل کر  
کے لیٹ چکے تھے۔ وہ خاموشی سے الماری سے  
کپڑے نکال کر ہاتھ روم چلی گئیں واپس آئیں تو شیرازی  
پوچھنے لگے۔

”سنی چلا گیا کیا؟“ آسیہ بی بی کو بڑا عجیب سا لگا کہ ابھی  
تو وہ آیا ہے اور ابھی اس کے جانے کی بات کر رہے  
ہیں۔

”نہیں۔“ پھر خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ ”میں  
سوچ رہی ہوں آج اسے یہیں روک لوں۔ تپا نہیں  
کتنے دنوں کی چھٹی پر آیا ہے۔“

”سعد وغیرہ آگئے؟“ اُن کی خود کلامی سن کر بھی  
شیرازی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور بچوں کے بارے  
میں پوچھنے لگے۔

”ہاں شاید، آواز تو آرہی ہے۔“  
”اوکے۔ تم تو ابھی بچوں کو کھانا وغیرہ دو گی۔“  
جب کہ مجھے نیند آرہی ہے۔ پلیز لائٹ آف کر قی  
جانا۔“ وہ خاموشی سے لائٹ آف کر کے کمرے سے  
نکل آئیں، پہلے کچن میں جا کر خود خانساماں کے  
ساتھ کھانا لکھوا کر ٹیبل پر لگایا پھر بچوں کو بلانے  
سعد کے کمرے میں آئیں تو دیکھا تینوں بھائی سنی کو  
گھیرے ہوئے تھے۔

”چلو بچو! کھانا کھا لو۔“ انہوں نے کہا تو سب  
کھڑے ہو گئے۔ ڈائننگ روم میں آکر سعد پوچھنے لگا۔  
”شرہ آپ کی کھانا نہیں کھائیں گی؟“  
”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں اسے اس کے



”نہیں بیٹا! البتہ کل پھر آؤں گا۔ بلکہ جتنے دن یہاں ہوں روز آؤں گا۔“

”یہاں کیوں نہیں رہتے۔ یہیں رہو ناں! آسیرنی برتنی سمیٹتے ہوئے بولیں تو وہ ان کا چہرہ دیکھنے یا شاید پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔“

”اماں! سنی کو اپنے پاس رکھ لیں۔ ورنہ ایک کمرے کے میرے سب بچے فجر سے دوڑ کر میرے جالیوں کے برسوں پہلے اس کی ماں اسے خود سے جدا کرنے کا سبب بتاتے ہوئے رورہی تھیں اس کے ذہن پر آج بھی نقش تھیں وہ پانیوں سے لبریز آنکھیں۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے موقی جنبہیں اس وقت اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں سمیٹا تھا اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ جب جب اسے وہ لبریز آنکھیں یاد آئیں وہ خود سے عہد کرتا رہا تھا کہ کبھی ان موتیوں کو مٹی میں نہیں رٹنے دے گا۔“

”ابھی تو میں ماموں جان کے پاس بھی نہیں گیا تھی! سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں اور پھر یہاں رہوں یا وہاں ایک ہی بات ہے۔“

پھر نومی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔  
”تم جا کر سوؤ۔ صبح اسکول بھی جانا ہے۔ میں کل شام میں آؤں گا تو پھر ڈھیر ساری گپ شپ کریں گے۔“ نومی اور نبی قدرے منہ پھلائے ہوئے چلے گئے تو آسیرنی خاںسا ماں کو چائے لانے کا کہہ کر۔

اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔  
”ہاں اب سناؤ۔ کوئی نئی تازہ خبر۔“

”میرے پاس کوئی نئی خبر نہیں ہے۔ بس یہ کہ میری پوسٹنگ کوئٹہ ہو گئی ہے اور اب میں یہاں سے کوئٹہ جاؤں گا۔ البتہ آپ سنائیں۔“ پھر بغور انہیں دیکھتا ہوا بولا۔

”کچھ کمزور لگ رہی ہیں۔ شاید اپنا خیال نہیں رکھتیں۔“

”بس بیٹا شمرہ کی طرف سے پریشان ہوں۔“  
”کیا ہوا شمرہ کو؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا تو آسیرنی شمرہ کے تمام حالات بتا کر کہنے لگیں۔

”بہت غلط ہوا ہے اس کے ساتھ۔ ابھی اتنی عمر بھی نہیں ہے۔ اور پھر ماں بھی بننے والی ہے۔“

”کمرے میں دے آتی ہوں۔ چلو تم لوگ شروع کرو۔“ وہ انہیں کھانے کا کہہ کر کچن میں چلی گئیں۔

”آپ بھی عجیب ہیں۔“ سعد اپنی پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے بولا۔ ایک بات کو اپنے اوپر طاری کر لیا ہے، جیسی تو ہر وقت جیسا رہتی ہیں۔“

”کون سی بات؟ وہ چونک کر پوچھنے لگا۔“  
”وہی حماد سے علیحدگی والی۔“ سعد یوں بولا جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو، جب کہ اس کے لیے خاصا بڑا انکشاف تھا اور حیران کن بھی۔ اور سعد اپنی کہے جا رہا تھا۔

”میں تو کہتا ہوں۔ دفع کریں بلکہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے جو ابھی حماد کی اصلیت کھل گئی ورنہ اگر چند سال بعد علیحدگی ہوتی تو زیادہ تکلیف دہ اور نقصان دہ ہوتی۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود سمجھ نہیں پایا۔  
”اچھا کر پوچھنے لگا۔“

”میرا خیال ہے۔ سنی بھائی کو کچھ معلوم ہی نہیں۔“  
نومی نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا۔

”کیا واقعی؟“ سعد نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”تمی آ رہی ہیں ان کے سامنے یہ موضوع چھیڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ خفا ہوتی ہیں۔“ آسیرنی کے قدموں کی آواز سن کر سعد نے جلدی جلدی کہا اور اپنی پلیٹ پر جھجک گیا۔ باقیوں نے بھی اس کی تقلید کی خود وہ بھی کھانے میں مصروف ہو گیا تھا لیکن اس کا ذہن مسلسل جھٹکتا رہا تھا۔ پھر کھانا ختم کر کے سب اٹھے تو آسیرنی اس سے کہنے لگیں۔

”سنی! تم یہیں بیٹھو۔ چائے آ رہی ہے۔“  
”ہم لوگوں کو چائے نہیں ملے گی؟“ سعد رک کر پوچھنے لگا۔

”بالکل نہیں۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ اور نومی بیٹی! تم جا کر سوئے کی تیاری کرو۔“

”لیکن تمی ابھی تو ہم سنی بھائی کے ساتھ گپ شپ کریں گے۔“ نومی نے کہا۔ پھر اس سے پوچھنے لگا۔ سنی بھائی آپ جیسے رہیں گے ناں؟“



میں اس کے مستقبل کا سوچتی ہوں تو مجھے خوف آنے لگتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہو۔ آگے اتنی پہاڑی زندگی آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں مئی۔“

”کیسے پریشان نہ ہوں۔ ماں ہوں اس کی؟“

”ماں آدہ ذرا سائیکھ ہوا یہ کبھی اس نے بھی ماں سمجھا آپ کو؟“

”سنی! انہوں نے تنہی لہجہ اختیار کیا۔ وہ نادان ہے اور پھر شروع سے اسے میرے بارے میں جس طرح سمجھا یا گیا، اس نے وہی سمجھا۔“

”کبھی وہ نادان ہوگی لیکن اب نہیں۔ جب کہ آج اس کے رویے سے مجھے لگا جیسے وہ اب بھی آپ سے متنفر ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔ وہ متنفر ہو پھر بھی میں مالوس نہیں ہوں۔ کبھی نہ کبھی تو وہ جان لے گی کہ اول روز میں نے اپنی مانتا کے جو دروازے اس کے لیے کھولے تھے۔ انہیں وقت کی آندھیاں ایک پل کے لیے بھی بند نہ کر سکیں۔“

”بس کہیں مئی! اس کے لیے آپ کی اتنی محنت میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔“

”اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ اب تمہارا شادی کا کیا پروگرام ہے؟“

”آسیہ بی نے خوبصورتی سے مومنوع دیا۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”تم نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے یا یہ کام مجھے کرنا پڑے گا؟“

”اوہ مئی! وہ سر کھانے لگا۔ یہ کام تو آپ ہی کو کرنا پڑے گا لیکن ابھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”کیوں بھی۔ ماشاء اللہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے ہو۔“

”پھر اچانک خیال آیا تو کہنے لگیں۔ مومنو تمہارے ماموں جان کی بیٹیاں بھی ہیں۔ اگر کہو تو وہاں تمہاری بات چلاؤں؟“

”نہیں مئی! وہ فوراً بول پڑا۔“

”کیوں کیا خامی ہے سارا اور ندرت میں؟“

”ایسی بات نہ کریں مئی، ان میں کوئی خامی نہیں ہے۔“

پھر مناجات کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”وہ دونوں میری بہنوں کی طرح ہیں اور ان کے بارے میں اس انداز سے کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں پہلے ان کی شادیاں کروں گا پھر اپنے بارے میں سوچوں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ آسیہ بی کا انداز سوچنا ہوا سنا تھا۔ اچھا ہوا کہیں نے تم سے بات کر لی کیونکہ مجھے دونوں لڑکیاں بہت پسند ہیں۔ اب تم نہیں تو پھر میں سعد اور سارا کی بات چیتوں کی۔“

”پہلے پاپا سے ضرور پوچھ لیجئے تھا؟“ اس نے پھر عام سی بات کہی اور آسیہ بی فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکیں۔ پھر اٹھتی ہوئی بولیں۔

”جب وقت آئے گا۔ ان سے بھی پوچھ لوں گی۔ ابھی تو سعد اور سارا دونوں ہی پڑھ رہے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے شیرازی یا سعد دونوں میں سے کوئی بھی میری بات رد نہیں کرے گا۔“

”قدرے تو وقت کے بعد کہنے لگیں۔ مجھے اصل فکر شرہ کی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔“

”پاپا نے کیا سوچا ہے شرہ کے بارے میں؟“

”پتا نہیں۔ ابھی تک انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے اندازا ہو کہ وہ اس کے لیے کیا سوچ رہے ہیں۔“

”پھر آپ کیوں خود کو بھگان کرتی ہیں؟ انہوں نے شاکی نظروں سے دیکھا تو فوراً کہنے لگا، اللہ مالک ہے کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔“

”تم اور چائے پیو گے؟“ وہ کپن کی طرف جاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”نہیں۔ اب میں چلوں گا۔“ وہ گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اسے رکنے یا یہ ہیں رہنے کے لیے رسمی جملوں کا سہارا لیتیں۔ وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل گیا۔ آسیہ بی کچھ دیر تک ہتے ہوئے پردے کو دیکھتی اور براؤنڈے میں ابھرنے والی اس کے جوتوں کی آواز سنکتی رہیں۔ پھر کچھ افسردہ سی ہو کر دوبارہ وہیں بیٹھ گئیں۔

”میں نے کیا پاپا؟“ وہ سوچنے لگیں۔ کہتے ہیں۔

245



انسان اپنے اچھے کردار اور اچھے عمل سے ایک عالم کا دل جیت لیتا ہے۔ اور میں ایک عمر کی ریاضت کے بعد آج بھی وہیں کھڑی ہوں۔ مگر اسی طرح مجھ سے متنفر اور میرا پتہ سنی لا کھ اپنے آپ کو مضبوط پوز کرے اس کے قدموں میں ملکیتی کی آواز ابھی بھی میں نے خود سنی ہے۔

”سنی میرے بچے!“ وہ بے اختیار اٹھ کر برآمدے میں نکل آئیں جیسے وہ ابھی گیا ہو اور وہ اسے پکار لیں گی، لیکن دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ چلتی ہوئی برآمدے کے آخری سرے تک آگئیں۔ گیٹ سے باہر سڑک کھل تاریکی میں ڈوبی تھی اور ایسی ہی تاریکیاں ان کے اندر اترنے لگیں۔

”پتا نہیں کہاں کمی رہی؟“ وہ سوچنے لگیں۔ مجھ سے کوئی ہوتی یا سنانے والے سارے پتھر تھے۔ جنہیں میرے خلوص کی مسلسل بارشیں بھی نہ لگیا سکیں اور اس سارے قہے میں کسی کا کیا کیا۔ سراسر نقصان میں تو میں اور سنی رہے۔

”آسیہ!“ شیرازی غالباً ایک نیندے کے لٹے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھول کر سوئی سوئی آواز میں پکارتا تو وہ چونک کر جہاں تھیں وہیں کھڑی ہو گئیں۔ ”کیا بات ہے تم ابھی تک سوئیں نہیں؟“ وہ بقیہ کمروں میں خاموشی محسوس کر کے پوچھنے لگے۔ تو آسیہ بی کا دل چاہا کہیں جس ماں کا بیٹا اس کے پاس رکنے کی حسرت لیے شکستہ قدموں سے گیا ہے۔ کیا وہ ماں اب سو کے تھی۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولیں، خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے قریب سے نکل کر کمرے میں آگئیں۔

پھر اگلی شام جب سنی آیا تو انہوں نے سوچا۔ آج وہ ہر صورت اسے یہیں روک لیں گی۔ اور کہیں گی جب تک اس کی چھٹیاں ہیں وہ یہیں رہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی اچانک مگرہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ شیرازی کچھ دیر پہلے ہی کلینک گئے تھے۔ انہوں نے پہلے کلینک فون کیا، شیرازی ابھی وہاں نہیں پہنچے تھے۔ تب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو فوراً ٹیکسی منگوا کر مگرہ کو ہسپتال لے گئیں۔ جہاں گئے بھر بعد اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا، گو کہ کیس نارمل تھا۔ لیکن کمزوری

کے باعث بعد میں مگرہ کی حالت تشویشناک ہو گئی۔ جس کی وجہ سے آسیہ بی کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ رات میں شیرازی چونکہ خود ڈاکٹر تھے، اس لیے انہوں نے مگرہ کی ڈاکٹر سے مل کر اس کے بارے میں اطمینان حاصل کر لیا۔ ان کا خیال تھا۔ امی جان مگرہ کے پاس رہیں گی۔ اور وہ آسیہ کو ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن امی جان بس کچھ دیر مگرہ کے پاس بیٹھیں۔ اور اس کی بیٹی کو تو انہوں نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ پھر فوراً واپسی کے لیے کہنے لگیں۔ یوں اگلے دس دن آسیہ بی مگرہ کے ساتھ ہسپتال میں رہیں اور اس دوران سنی ایک بار ان سے ملنے آیا۔ اور جاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ”امی! مجھے یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔ پلیز آپ ہی کسی دن آجائیں ناں!“

اور وہ کوشش اور چاہنے کے باوجود نہیں جاسکی تھیں کیونکہ مگرہ کے ساتھ اس کی بیٹی کی دیکھ بھال بھی وہی کر رہی تھیں۔ پھر جب وہ گھر آئیں تو معلوم ہوا سنی کی چھٹیاں کینسل ہو گئی ہیں۔ اور وہ ایک دو دن میں کوئٹہ جانے والا ہے۔ انہیں بہت افسوس ہوا کہ ڈیڑھ دو سال بعد وہ آیا تھا اور وہ اس سے ٹھیک طرح سے ملی بھی نہیں تھیں۔ بہر حال وہ اب فوراً اس کے پاس جانا چاہتی تھیں، لیکن پھر یہاں کا مسئلہ بنا۔ کیونکہ مگرہ اپنی بیٹی کی دیکھ بھال کے قابل نہیں تھی۔ اور گھر میں سوائے خالسا ماں کے اور کوئی ملازمہ بھی نہیں تھی۔ جس سے وہ بیٹی کا فیڈر بناتے اور پیپر وغیرہ تبدیل کرنے کا کہہ سکتیں۔

یوں اپنا جانا ملتوی کر کے انہوں نے سنی کو بلوایا۔ اور وہ آیا ضرور۔ لیکن انہیں مسلسل مگرہ اور بیٹی میں مصروف دیکھ کر بہت جلد واپس بھی چلا گیا۔ اس وقت تو اسے اپنی ماں پر واقعی حیرت ہوئی تھی۔ جب وہ بیٹی کو گود میں لیے کہہ رہی تھیں۔ ”مگرہ کو مجھ سے چھینا گیا۔ لیکن دیکھو ویسی ہی بیٹی میری آغوش میں آسمان ہے اور اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“

”بس کرمی ممتی!“ وہ جھپٹا کر بلواتا تھا جس روز اس کی ماں ٹھیک ٹھاک ہو گئی۔ اسے ایک پل بھی



آپ کی آغوش میں نہیں رہنے دے گی۔  
 ”نہیں بٹیا! میں اسے سمجھاؤں گی۔ اس کے لیے  
 یہی بہتر ہے کہ وہ بچی کو میرے پاس رہنے دے۔“  
 ”اور وہ سمجھ جائے گی؟“ وہ طنز پر مبنی ہنستا تھا۔  
 ”اسے سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اب ہم شو کے لیے  
 نئے سرے سے سوچیں گے، اور کوئی بھی شخص  
 مشکل ہی سے اس بچی کو قبول کرے گا۔“  
 ”فرصت کریں ممتی اگر دوسرا شخص اس بچی کو ساتھ  
 لے جانے پر رضد ہوا تب؟“ وہ پتا نہیں کیوں  
 بحث کرنے لگا تھا۔

”تب؟“ آسیہ بی سوچ میں پڑ گئیں۔ اور بالکل  
 بغیر ارادی طور پر انہوں نے بچی کو اپنے سینے میں  
 چھین لیا تھا۔ یوں جسے ابھی کوئی اسے چھینے آ رہا ہو  
 اور وہ اسے دینا نہ چاہتی ہوں۔  
 ”آپ کو یہ بہت عزیز ہے؟“ وہ کھوٹے  
 ہوئے ٹوٹے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔  
 ”ہاں؟“ وہ بھی اپنے آپ میں نہیں تھیں۔  
 ”کیوں؟“

”اس کے پس منظر میں تم اور مثرہ ہوا اور وہ ہزاروں  
 لاکھوں بچے کہ کسی کی ماں نہیں اور کسی کا باپ اور ہر  
 دو صورتوں میں مامتا کی آغوش کو ترستے ہوئے۔ اگر  
 ہر البس چلے تو میں اپنی مامتا کے پر اس پوری کائنات  
 پر پھیلا دوں کہ وہ ہزاروں لاکھوں بچے میری مامتا کے  
 ساتھ نہیں چلے آئیں۔ کہیں کوئی محرومی نہ رہے کہیں  
 کوئی تنگنی نہ رہے۔ میں آن سارے سی اور ساری  
 مثرہ کی طرف آنے والی گرم، سرد ہواؤں کو اپنے  
 وجود پر سہاروں؟ پھر خود ہی کہنے لگیں۔

”میں شاید ایسا نہیں کر سکتی۔ لیکن اس بچی کے  
 لیے تو کر سکتی ہوں۔ اتنا کہ اسے مثرہ نہ بننے دوں۔ بظاہر  
 پتھر لیکن اندر سے کانچ سے زیادہ نازک کہ ذرا  
 سے اشارے سے کر بچی کو جی ہو جائے۔“  
 ”آپ سے کس نے کہا کہ وہ کانچ سے زیادہ  
 نازک ہے؟“

جس ممتی کے  
 مامہر بیوٹیشن کا تہ  
**سونیا شیپ**

جسے ممتی

پہلی بار جڑی بوٹیوں کے  
 وٹامن ای شامل کیا گیا  
 ہال گرنا ۰ قبل از وقت  
 قدرتی چمک نہ ہونا ۰ خشک  
 سونیا شیپ، بالوں کے  
 کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے  
 ریٹھا، اگھیکوار اور دیگر جڑی بو  
 اس میں وٹامن ای بھی شامل  
 نے ثابت کیا ہے کہ وٹامن ای  
 کے لیے اہم ہے اور خصوصاً  
 چمک دار اور مضبوط بنانا  
 بالوں کی صفائی کے لیے  
 چیز ہے۔ یہ بالوں کے کو  
 ہے اور بہتر کنڈیشن

قیمت: ۲۰/-

دوسرے شہروں میں رہنے  
 ۳۔ شیشیوں کے لیے  
 ۲۔ شیشی  
 ایک شیشی  
 کا ممتی آرڈر بھجوائیں۔  
 ملنے کا پتہ

عبد المالك سادہ کا  
 پتہ شاپ فریڈ

۹/۲ بیت الفرقان فرسٹ  
 بلاک C-13 مین یونیورسٹی  
 گلشن اقبال



تہا رہے سر پر ہاتھ نہیں رکھا۔ اٹھاتے سے تہا را باپ  
بھی چھین لیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں کبھی فیہ لڑی کی  
دوسری شادی نہ کرتی۔ ماں نہیں تھی کم از کم باپ تو  
تہا را رہتا۔

لیکن دادی جان انہوں نے تو کبھی مجھ سے سخت  
بات نہیں کی۔ وہ گئے دنوں کو سوچتے ہوئے بولی تھی۔  
"ہی تو اس کی چالاکی ہے۔ جب سے تم بچھا رہی ہو  
ہو، تم سے بیٹھی بن کر ملتی ہے در نہ تم خود ہی سوچو اگر  
یہ شروع سے ایسی ہوتی تو میں تمہیں اتنی دُور کیوں  
بجھتی۔"

"یہ تو ہے" اس نے دادی جان کی باتوں پر یقین کر  
لیا تھا۔ اور اسی دن کی اتنی محبتوں کو بناوٹ پر محمول کرنے  
لگی تھی۔ لیکن اب وہ کسی کسی وقت بہت پریشان ہو  
جاتی۔

"آخر اب وہ اتنی مہربان کیوں ہیں؟ کیوں میرا آنا  
خیال رکھتی ہیں۔ اب تو میں مکمل طور پر ان کے رحم و کرم  
پر ہوں۔ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کر سکتی ہیں۔ کوئی  
لوپھنے والا بھی نہیں پھر۔"

"ہو سکتا ہے دادی جان نے انہیں غلط سمجھا ہو۔  
کسی وقت ایسا خیال آتا تو وہ اُلٹنے لگتی۔"

"لیکن دادی جان کو کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے جو  
دیکھا ہو گا وہی مجھ سے کہا۔ وہ غلط بیانی کیوں کرنے  
لیگیں۔"

انہی مختلف کیفیات میں گھرے کتنے بہت سارے  
دن گزر گئے۔ وہ پہلے بھی بہت زیادہ شوخ و شریک لڑکی  
تھی، لیکن اب تو کچھ زیادہ ہی گم صم رہنے لگی تھی۔  
کبھی سعد زبردستی چھینچھین لاتا تو سب کے درمیان بیٹھ جاتی۔  
ورنہ زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں رہتی تھی۔ ویسے بھی

اب اسے اپنی غلطی کا احساس زیادہ ہونے لگا تھا۔ اس  
وقت تو یقیناً اس کی آنکھوں پر پریشانی بندھی تھی یا حماد کا جادو  
سر چڑھ کر بول رہا تھا جو اس نے اپنے پاپا کا لحاظ نہیں  
کیا تھا۔ بے دھڑک کہہ ڈالا کہ ابھی اور اسی وقت حماد  
سے شادی کرے گی اور اب جب اس وقت اور ان باتوں  
کو سوچتی تو اسے پسینہ آ جاتا۔ اپنے آپ پر حیرت بھی  
ہوتی کہ وہ کیسے اتنی دلیر ہو گئی تھی۔ یا ساری شرم و حیا  
کس طرح بالائے طاق رکھ چھوڑی تھی۔

"میں جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں بیٹا۔ اگر ایسا نہ  
ہوتا تو وہ ایک عقو کر سے ان حالوں کو نہ پہنچتی۔ اجیر  
اس لیے نہیں کرتی کہ اپنی دادی کی طرح نام نہاد جھوٹی  
انا کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ جس دن یہ لبادہ  
تار تار ہوا تم دیکھنا وہ اندر سے کتنی شکستہ اور معصوم  
سی لڑکی ہے۔"

انہوں نے یقین سے کہا تھا اور اس سے سنی کو لگا  
جیسے اس کی ماں دیوانی ہو گئی ہے۔

اور شاید وہ دیوانی ہی تھیں کہ جو ارمان ٹرہ کے لیے  
دل میں تھکے وہ اب اس کی بچی پر پورے ہو رہے تھے۔  
سارا دن اسی میں لگی رہتیں اور ٹرہ کی حالت کے پیش نظر  
رات میں بھی اسی کے کمرے میں سوئی تھیں۔ بچی نیند  
میں ذرا سا کسمپاتی تو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتیں اور اس کے  
روہنے پر تو کتنی کتنی دیر تک اسے گود میں لے کر ٹھہرتی  
رہتی تھیں۔

ٹرہ جہاں امی جان کے روئے سے رنجیدہ تھی۔ وہاں  
اُن کی بے عرض محبتوں اور خدمت گزار یوں کی معترف  
ہوئی جا رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بار بچپن میں  
وہ اُن کے گرد منڈلانے لگی تھی۔ کبھی وہ اُن کے بارے  
میں سوچتی تو حیران ہوتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔  
کہ جس عورت نے بچپن میں اسے اپنی آغوش سے  
محروم رکھا۔ وہ اب اس پر اتنی مہربان کیوں ہے۔  
اُسے یاد تھا جب وہ میٹرک کے امتحانوں سے فارغ ہو  
کر آئی تھی تو اُن کے نرم روئے کی تعریف کرتے ہوئے  
اس نے دادی جان سے کہا تھا۔

"دادی جان! آنٹی مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔  
مجھے لگتا ہے سعد نومی اور بنٹی سے بھی زیادہ۔"  
"یہ سب دکھاوا ہے" دادی جان نے فوراً کہا تھا۔  
اور پھر درد بھری آواز میں اُن کے بارے میں یوں تفصیل  
بتاتی تھی۔

"یہ عورت نہیں ڈانٹ ہے۔ تم کیا جانو میری بچی! اس  
نے تم پر کیسے کیسے ظلم کیے ہیں۔ جب ہی تو میں نے  
تمہیں ہاسٹل بھیج دیا ورنہ اگر یہاں رہتیں تو یہ پتا نہیں  
تہا را کیا حشر کرتی۔ دیکھنے میں کتنی سیدھی لگتی ہے۔  
میں اسے اس لیے بیاہ لائی تھی کہ یہ تمہیں ماں کی کمی  
محسوس نہ ہونے دے لیکن اس نے تو ایک دن بھی



میں کبھی شہزادی کی  
نہ کم از کم باپ تو

جی جھٹ سے سخت  
ہوئے بولی تھی۔  
سے تم بھلا ہوئی  
ہی سوچو اگر  
دور کیوں

پا پر تھیں کر  
بول کرنے  
شان ہو

آنا  
دکم  
کئی

جو کہ حادثے علیحدگی کے بعد یہاں آنے پر پایا  
نے سے ملامت نہیں کی تھی لیکن وہ خود ہی ان سے  
دوست بن گئی تھی۔ ان کا سامنا کرنے کی ہمت بالکل نہیں  
تھی۔ اگر دادی جان اس کی کوکھ اجاڑنے کی بات نہ کرتیں  
تو شاید وہ کبھی پایا کے گھر نہ آتی۔ لیکن اور کوئی جگہ نہیں تھی  
جہاں وہ جاتی۔ اس لیے مجبوراً اسے یہاں آنا پڑا۔  
اپنے طبع پر وہ کوشش کرتی تھی کہ پایا سے سامنا نہ  
ہو بلکہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔  
کسی وقت اچانک سامنا ہو جاتا۔ تو وہ کمتر کر نکل جاتی۔  
اس کا خیال تھا ڈیلیوری کے بعد وہ پھر دادی جان کے  
پاس چلی جائے گی لیکن دادی جان اپنی بات رد کیے جانے  
پر ایسی خفا تھیں کہ اس کی پیچی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور  
نہ ہی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔  
اسے ملاں ضرور تھا لیکن جب وہ دونوں گھروں کا  
موازنہ کرتی تو اپنے آپ کو یہاں بہتر حال میں پاتی۔ یہاں  
نہ تو کوئی اس کی عقلی کو بار بار دہراتا تھا اور نہ وقت  
بے وقت ملامت ہوتی اس کے برعکس سب کی کوشش  
یہ تھی کہ وہ حامد کیلانی کے ساتھ گزیرے مختصر وقت کو فراموش  
کر دے۔ بلکہ یوں سمجھے کہ اس کی زندگی میں وہ ماہ و سال  
آئے ہی نہیں تھے۔ اور وہ کوشش کے باوجود ان تلخ  
یادوں کو فراموش نہیں کر پار ہی تھی۔  
حامد کیلانی کی شخصیت تو سحر انگیز تھی ہی۔ اس کی  
باتوں میں بھی وہ جادو تھا کہ وہ کچھ ذہن اور ناپختہ عمر کی لڑکی  
اس بڑی طرح اس کے جال میں پھنسی کہ اس کی خاطر سارے  
رشتوں کو بھلا بیٹھی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ غلط ہو جاتا تو  
یقیناً وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی اور  
اس وقت تک تو وہ اپنے آپ پر رشک کرتی ہی رہی  
تھی جب تک اس کی اصلیت سے واقف نہیں ہوئی  
تھی۔ اور اصلیت جاننے کے بعد جس بڑی طرح وہ ٹوٹی  
تھی تو اب تک اپنے آپ کو سمیٹنے میں مصروف تھی۔ گو کہ  
اس کی طبیعت اب پہلے سے کافی بہتر تھی۔ صحت بھی  
اچھی ہو رہی تھی لیکن دل درد سے آشنائی حاصل کر کے  
باقی ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ کچی  
آسیبی سے مانوس ہو گئی تھی اور زیادہ تر انہی کے پاس  
رہتی تھی۔ ورنہ وہ کبھی اسے اتنی توجہ نہ دے پاتی۔  
پھر آسیبی کے بار بار سمجھانے پر وہ گھر کے کاموں

میں حصہ لیتے لگی۔ یوں اس نے خود محسوس کیا کہ جب تک  
وہ مصروف رہتی ہے تلخ یادوں سے دامن بچا رہتا ہے  
پھر وہ خود مصروف رہنے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔  
کبھی گھر کی صفائی سمجھاتی۔ کبھی ترتیب بدلتی اور کبھی خانا بنا  
کو ہٹا کر خود اس کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔  
رفتہ رفتہ اس کے وجود پر چھایا جھوٹو نورنے لگا  
اور وہ پھر سے زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔ عہد رفتہ سے  
ناتا کافی حد تک ٹوٹ گیا تو ذہن آپ ہی آپ کٹنے  
والے دنوں کی طرف سفر کرنے لگا۔ اور بہت ساری  
باتیں سوچتے ہوئے آخر میں وہ اس خیال پر گرفت  
مضبوط کر لیتی تھی کہ پایا اور آئی کی موجودگی میں اسے  
اپنے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو  
اس کے لیے بہتر سمجھیں گے کرے گا۔  
اس وقت وہ دو پہر کا کھانا پکا کر کچن سے نکلی تھی۔  
دوپٹے کے پلو سے پسینہ صاف کرتے ہوئے اپنے  
کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ سنی کو کتے دیکھ کر وہیں  
رک گئی۔ اس نے فوراً ہی سے اٹھ کے اشارے  
سے سلام کیا پھر قریب آکر پوچھنے لگا۔  
"مٹی کہاں ہیں؟"  
"وہ اپنے بھائی کے گھر گئی ہیں۔ پھر پھر سوچ انداز  
میں بولی۔" "تم بھی تو غالباً وہیں رہتے ہو۔ تمہاری آن  
سے ملاقات نہیں ہوئی؟"  
"میں آج کل کوئٹہ میں ہوں اور اس وقت سیدھا  
یہیں آ رہا ہوں۔ اگر معلوم ہوتا کہ مٹی ماموں جان کے گھر  
گئی ہیں تو وہیں چلا جاتا۔"  
"آؤ۔ اندر چل کر بیٹھو۔" وہ اسے پلٹنے پر آمادہ دیکھ  
کر بولی۔  
"میرا خیال ہے میں چلوں۔"  
"اس طرح تمہاری آنٹی سے ملاقات نہیں ہوگی۔"  
"کیا مطلب؟"  
"آنٹی آنے والی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا وہ دو پہر کا  
کھانا نہیں آکر کھائیں گے۔"  
"اچھا۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔  
"تم سعد کے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں تمہارے  
لیے۔"  
"اسکول آؤں اگر گھر میں موجود ہو تو۔"



وہ ہمیشہ سے مختلف اس لڑکی پر ایک نظر ڈال کر  
سعد کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ کچن —  
کی طرف چلی گئی۔ جلدی جلدی اسکو انش بنا کر سعد کے  
کمرے میں آئی تو وہ جو جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا  
اسے دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھا۔

”گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟“ اس کے ہاتھ سے  
گلاس لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”سب آنے والے ہیں۔ پاپا کلنک سے۔ سعد نوٹی  
اور بیٹی کالج سے اور آنٹی اپنے میکے سے“

”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ وہ ایک ہی  
سانس میں گلاس خالی کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے  
پوچھنے لگا۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔  
”پچھلی بار میں آیا تھا تو اس وقت آپ ٹھیک نہیں  
تھیں“

”اچھا“ وہ ہنسی ”غالباً چھ مہینے پہلے کی بات کر  
رہے ہو تم۔ تو کیا اب تک میں اسی حالت میں رہتی۔  
میرا مطلب ہے یہ تھار“

”ہیں“ وہ کنفیوز ہو گیا۔ اصل میں ممتی نے بھی  
ایک دو بار دیکھا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی  
اور وہ خاصی فکر مند تھیں۔

”آنٹی تو یہی ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی  
ہیں“

”خاص طور سے آپ کے لیے“ وہ بے اختیار کہہ گیا  
پھر فوراً سنبھل کر بولا۔ ”آپ کی بیٹی کیسی ہے؟“  
”ٹھیک ہے“

”کہاں ہے؟ کیا وہ بھی کہیں گئی ہوئی ہے؟“ اس  
نے اپنی بات کو مزاح کا رنگ دیا۔

”ہاں ا“ وہ ہنس پڑی۔ ”وہ آنٹی کے ساتھ گئی  
ہے“

”کیا مطلب۔ کیا وہ آپ کے بغیر رہ جاتی ہے؟“  
”اں“ میرے بغیر تو رہ جاتی ہے۔ البتہ آنٹی کے بغیر  
نہیں رہ سکتی۔ وہ خاموش رہا۔ اصل میں سمجھ میں بھی نہیں  
آ رہا تھا کہ اب کیا بات کرے۔

”تمہیں اگر بھوک لگی ہو تو کھانا لگا دوں؟“ وہ اس  
کے خاموش رہنے پر پوچھنے لگی۔

”ہیں“

”میرا خیال ہے“ ہاتھ لے لو۔ فریش ہو جاؤ گے۔  
اتنے میں سب لوگ آ جائیں گے۔ پھر مل کر کھانا کھا لیں  
گے۔“ وہ اس سے تین سال بڑی ممتی تو اسی حساب سے  
بات کر رہی تھی جبکہ وہ بڑا عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔  
”ہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں“

”تمہاری ممتی۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ کچھ میلے  
میلے سے لگ رہے ہو۔“ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو کہیں  
اچھا کر بولی۔ ”آنٹی کو میلے پتے لپٹے تھے جس لگتے؟“  
”اور آپ کو؟“ اس نے براہ راست اس کی آنکھوں  
میں دیکھ کر پوچھا تو لمحو بھر کو وہ زور سے ہو گئی پھر فوراً سنبھل  
کر بولی۔

”میرا خیال ہے۔ میلے پتے کسی کو بھی اچھے نہیں لگتے۔“  
”آپ صرف اپنی بات کریں۔“  
”مجھے بھی نہیں“ یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی  
اور چلنے کو ممتی کو وہ کہنے لگا۔

”میں پتہ نہیں ہوں اور نہ ہی میلا۔ مجھے دیکھنے والی  
آنکھ میں میل ہو سکتا ہے۔ مجھ میں نہیں۔“ اس نے ایک  
نظر سر تاپا اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل  
گئی۔

پھر ایک ایک کر کے سب آ گئے تو اس نے خانماں  
کے ساتھ مل کر ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ کھانے کے دوران  
شیرازی نے رسمی جملوں میں سنی سے اس کا حال احوال  
پوچھا اور سب سے پہلے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے  
گئے۔ سنی اب ان باتوں کو اگر محسوس کرتا بھی تھا تو ظاہر  
نہیں ہونے دیتا تھا۔

”ممتی! میں اب بہت تنہائی محسوس کرنے لگا ہوں۔“  
کھانے کے بعد وہ آسیہ بی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں  
آیا تو کہنے لگا۔

”اسی لیے تو میں کہتی ہوں، شادی کر لو۔“ آسیہ بی نے  
فوراً حل بتایا۔

”نہیں ممتی! میں چاہتا ہوں، آپ میرے ساتھ  
چلیں۔“

”میں کیسے جا سکتی ہوں؟“  
”پلیئر ممتی! انکار نہ کریں۔ بس کچھ دنوں کے لیے۔“  
وہ چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح منت سے بولا۔



”لیکن کیا؟“ وہ فوراً بول پڑیں۔

”تم مقررہ سے پوچھ لو۔“

”اس سے بھی ضرور پوچھوں گی، پہلے آپ تو ہی پوچھیں۔“

”وہ اسی وقت جواب سننا چاہتی تھیں۔“

”میں کیا کہوں، بیٹا بھی تمہارا اور بیٹی بھی تمہاری۔“

”جو چاہے کرو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ

اس وقت آپ صرف بیٹی کے باپ بن کر سوچیں اور

فیصلہ کریں تو آپ کیا کہیں گے؟“ وہ یقیناً مکمل اطمینان

چاہتی تھیں۔ اور شیرازی کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔

”پوری ایمانداری سے کہوں گا کہ سنی سے اچھا رشتہ

شر کو نہیں مل سکتا۔“

”جی؟“ وہ خوش ہو گئیں۔

”ہاں، جو صورت حال مقررہ کو درپیش ہے، اس لحاظ

سے تو یہی بہتر ہے۔ پھر بھی مقررہ سے ضرور پوچھنا۔“

”ظاہر ہے اس کی مرضی کے بغیر تو کچھ نہیں ہوگا۔ میں

کل ہی اس سے بات کر دوں گی۔ اور میرا خیال ہے آپ

امتی جان سے بھی بات کریں۔“

”امتی جان سے؟“

”ہاں، ہو سکتا ہے، انہوں نے مقررہ کے لیے کچھ اور

سوچا ہو۔“ شیرازی کچھ دیر تک ان کی طرف دیکھتے رہے پھر

کہنے لگے۔

”امتی جان نے خواہ کچھ بھی سوچا ہو تب بھی میں سمجھتا

ہوں مقررہ کے لیے یہی بہتر ہے اور یہ بات میں انہیں

”تم یہاں کیوں نہیں آ جاتے؟“

”میں جی ایس آپ میرے ساتھ چلیں۔“

”بیٹا تم سمجھ نہیں رہے۔ یہ بچی میرے بغیر نہیں

رہ سکتی۔ میں کیسے اسے چھوڑ کر جاؤں۔“

”یہ بچی؟“ وہ قایلین پر سوئی بچی کی طرف دیکھنے لگا

اور دل چاہا جیج کر مقررہ کو آواز دے اور کہے۔ ”لے جاؤ

اپنی بچی کو اور کچھ وقت کے لیے میری ماں کو صرف میری

ماں رہے دو۔ وہ بمشکل اپنی آواز کر دیا یا لیکن اس

اچانک خواہش کو کسی طرح نہیں دبا سکا تھا۔

پہلی بار سنی کا خط پڑھ کر آسیہ بی بی بے حد حیران ہوئیں۔

دوسری بار پڑھا تو سوچ میں پڑ گئیں اور تیسری بار پڑھتے

ہوئے ان کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ کھیلنے لگی

نئی۔ پھر وہ بے چینی سے شیرازی کا انتظار کرنے لگیں۔

اس دوران ممتی بار مقررہ پر نظر پڑی ہر بار انہوں نے دل

میں ڈھرایا۔

”حیرت ہے، یہ بات میں نے کیوں نہ سوچی۔“

شیرازی اپنے مقررہ وقت پر کھانے وغیرہ

کے بعد جب وہ فراغت سے ان کے پاس بیٹھیں تو کہنے

لگیں۔

”آج سنی کا خط آیا ہے۔“ جواب میں وہ ایک نظر ان

پر ڈال کر دوبارہ میگزین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تب وہ

بغیر کسی تمہید کے بولیں۔

”وہ مقررہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”کون؟“ اب کے شیرازی چونکے ضرور لیکن غائب

دماغی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

”میرا بیٹا سنی؟“ آپ ہی آپ ہلچے میں زلزلہ سمٹ

آ گیا۔ جیسے کہہ رہی ہوں ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں

میں ایک ہے۔ تمہاری بیٹی کو اس جیسا کہیں نہیں ملے گا۔

”سنی؟“ شیرازی کے صرف ہونٹ ہلے پھر پھر سوچ

انداز میں بولے۔ ”لیکن وہ تو غالباً مقررہ سے چھوٹا ہے۔“

”تو کیا ہوا؟“ میرے نزدیک تو یہ کوئی قابل اعتراض

بات نہیں ہے اور پھر جب لڑکا خود اس بات کو اہمیت

نہیں دے۔ تو ہم۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔“

مقررہ جس ہو جاؤ گے۔  
پھر مل کر کھانا کھا لیں  
تو اسی حساب سے  
ما محسوس کر رہا تھا۔

ی ممتی کہ کچھ پہلے  
کر دیکھا تو کہہ سکتے  
تھے۔  
کی آنکھوں  
میں دھندلاہٹ

دھندلتے۔

ہوتی

لی



سنی سے بھی پوچھا ہے۔

”اس کی خواہش پر ہی میں ایسا کر رہی ہوں۔ میرا مطلب ہے اس نے کچھ ہے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”میرے حالات جلنے کے باوجود وہ نظریں جھکا کر بولی۔“

”اے! آئیہ بی نے اس کے ہاتھ تمام لیے تو پتا نہیں کیسے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔“

”ارے روتی کیوں ہو بیٹا؟“

”آئیہ! میں نے تو کبھی آپ کے لیے مثبت انداز سے نہیں سوچا۔ پھر آپ کیوں؟“

”میری جان! آئیہ بی نے اس کا سراپنہ کندھے سے لگایا۔“

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہیں اگر مثبت انداز سے سوچنا سکھایا گیا ہوتا تو تمہیں ضرور اندازہ ہوتا۔ میری محبتوں اور شفقتوں کا۔“

”پھر بھی میرے منفی رویے کی بدولت آپ اپنی محبتوں کے پریمیٹ بھی تو سکتی تھیں۔“

”نہیں بیٹا! اولاد کے لیے دامن کبھی تنگ نہیں ہوتا۔ محبتیں کبھی تقویٰ نہیں پڑتیں۔ پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔“

”تمہارے دل میں اب بھی کوئی خدشہ ہو تو کہہ ڈالو۔ میں بالکل برا نہیں مانوں گی۔“

”نہیں آئیہ! میرے بارے میں آپ کو اختیار ہے۔ جو چاہیں کریں لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ میں سنی کے قابل نہیں ہوں۔“

”تم کس قابل ہو، یہ میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ انہوں نے اس کی پیشانی چومی پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔“

”اب تم نے رونا نہیں ہے۔ اور سنو۔ سنی کے بارے میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔“

”پھر سنی کیونکہ اپنے ماموں ممانی کے پاس تھا۔ اس لیے آئیہ بی کی خواہش پر ان کے بھتیجا اور بھابی سنی کے سرپرست کی حیثیت سے باقاعدہ اس کا پیغام لائے۔“

”دس گھر کی ایک تقریب میں دونوں کی نسبت کا اعلان

کرتے ہوئے شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی۔

امتی جان نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی تھی کیونکہ انہوں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ آئیہ بی کسی مقام پر سرخرو ہوں۔ ہمیشہ رکاوٹ بننے کی کوشش کی لیکن آج جس مقام پر آئیہ بی سرخرو ہو رہی تھیں۔ وہاں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کا حوصلہ امتی جان میں نہیں تھا۔ وہ لاکھ ٹروے

خفا سہی آئیہ بی سے متنفر تھی لیکن یہ مزور جانتی تھیں کہ ٹروے کے ساتھ ساتھ اس کی بچی کے خوش آئند مستقبل کی ضمانت سنی کے علاوہ اور کوئی نہیں دے سکتا۔

شادی کے بعد ٹروے بچی کو ساتھ لے جلنے یا آئیہ بی کے پاس چھوڑ دے۔ ہر دو صورتوں میں بچی کے لیے

امان ہی امان تھی اور وہ لاکھ کسی کے سامنے اعتراف نہ کرتیں لیکن ٹروے کے غلط اقدام نے انہیں یہ باور کرا دیا تھا کہ غلطی ان ہی سے ہوئی تھی۔ اگر وہ طرف بڑا رکتیں

تو اسی وقت تسلیم کرتے ہوئے آئیہ بی کی اہمیت بھی تسلیم کر لیتیں۔ لیکن وہی حجت کھارنے والی بات کہ دوبارہ

ہر ایک تو گوارا نہ ہوئی۔ دوسرے دل میں بھی ترازو ہو گئی تھی۔ جب ہی انہوں نے سارا الزام آئیہ بی کے

سر رکھتے ہوئے ٹروے کو یہ کہہ کر ان سے مزید متنفر کیا تھا کہ اگر آئیہ بی اس کے سر پر دست شفقت رکھ دیتیں

تو کبھی اسے گھر سے دُور نہ بھیجا جاتا۔ اور نہ اس کے ساتھ ایسا کوئی المیہ ہوتا لیکن وقت بڑا نا صبح ہے۔ کہیں نہ

کہیں حقیقت سامنے لے ہی آتا ہے۔ یا پھر آئیہ بی کی اچھی سوچ اور نیک نیتی سے عمل ہار گاہ۔ یزداں

میں مقبول ہوا کہ جو اپنے لیے چاہو وہی دوسرے کے لیے۔

ٹروے اور سنی ایک ہی کشتی کے سوار دو معصوم بچے۔ انہوں نے جس طرح سنی کے لیے سوچا اور چاہا۔ وہی

جذبہ ٹروے کے لیے بھی رکھتی تھیں پھر خواہ حالات کیسے بھی رہے۔ وہ اول روز جو عزم لے کر چلی تھیں۔

اس پر ہمیشہ ثابت قدم رہیں۔ اور یقیناً یہ ان کی نیک نیتی اور ثابت قدمی کا

انعام تھا جو اس وقت شیرازی، سنی کو ساتھ لگائے کہہ رہے تھے۔

”بیٹا! ابھی تو تمہاری چھٹیاں باقی ہیں۔ پھر آئی جلدی کیوں جا رہے ہو، یہیں رہو ناں۔“



نہ رکھ دی گئی۔  
 میں شرکت نہیں کی تھی  
 آسیہ بی کسی مقام پر  
 نہ کی لیکن آج جس مقام  
 کوئی رکاوٹ کھڑی  
 وہ لاکھ فٹ سے  
 زور جاتی تھیں کہ  
 سند مستقیم کی  
 سکتا۔  
 نے یا آسیہ بی  
 مٹی کے لیے  
 سے اعتراف  
 باور کرا دیا  
 بڑا رکتیں  
 منت بھی  
 نہ کہ دوبارہ  
 ناز و ہو  
 کے  
 سفر کیا  
 ہ دین  
 اتھ  
 نہ

اور آسیہ بی زیادہ نہیں بس چند ماہ پہچھے پلٹ گئیں۔  
 سنی چلا گیا کیا؟ ابھی وہ آیا تھا اور ابھی شیرازی پوچھ  
 رہے تھے۔  
 آسیہ بی نے فوراً سر جھٹک کر خود ہی ہر بات کو  
 دھمک دھکیلا اور سنی اور اس کے پہلو میں کھڑی مقررہ کو  
 دیکھنے لگیں جس کے چہرے پر ان چند دنوں میں ملنے  
 والی بچی خوشیوں کے عکس جھللا رہے تھے۔ وہ طمانیت  
 کے احساس میں گہری آگے بڑھ آئیں۔

”تمہارے پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں جب تک  
 چھٹیاں ہیں، یہیں رہو۔“  
 ”نہیں ممتی! یہیں جانے دیں۔“  
 پھر مقررہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”ہم دونوں اپنی اپنی ڈار سے پھڑپھڑے ہوئے پیچھی  
 تھے۔ مسافروں کے بعد اپنی ڈار سے آتے ملے ہیں لیکن  
 یہ وہ وقت ہے جب ہمیں خود اپنا آشیانہ بنانا ہے  
 اور تنکا تنکا جمع کریں گے تبھی تو آشیانہ بنے گا ناں۔“  
 اور قدیمے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”میں نہیں کہوں گا ممتی! ہمیں اپنی دعاؤں میں  
 رخصت کر دیں بلکہ میری خواہش ہے کہ آپ اپنی  
 دعاؤں کا سا ثبوت لے کر ہمارے ساتھ چلیں۔ بس  
 کچھ دنوں کے لیے ممتی۔“

اس وقت اس کے لہجے میں منت نہیں تھی نہ  
 عاجزی بلکہ وہ سر اٹھا کر اس یقین سے کہہ رہا تھا جیسے  
 اس کی بات رد نہیں کی جائے گی۔ اور آسیہ بی حیران  
 ہو کر دیکھنے لگیں کہ ایک عمر کی ریاضت کے باوجود وہ  
 اسے جو مقام نہیں دلا سکی تھیں وہ اس نے اپنے ایک  
 اچانک فیصلے سے غرور حاصل کر لیا تھا۔

”بیٹا! وہ کوئی عذر تراشنا چاہتی تھیں کہ شیرازی  
 بول پڑے۔“

”چلی جاؤ آسیہ! اگر بچوں کی یہی خواہش ہے تو  
 ہاں آئی! مقررہ بولی تھی کہ اس نے خود اٹوٹ دیا۔  
 ”آئی نہیں ممتی۔“

”ممتی! مقررہ نے بولنا ہی دہرایا پھر آسیہ بی کی طرف  
 دیکھ کر بولی۔“

”ممتی! میری جان! اس کے ہونٹوں سے یہی ایک

لفظ سننے کے لیے آسیہ بی نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ یوں  
 لگا جیسے اس نے ابھی ابھی بولنا سیکھا ہو اور سب سے  
 پہلے انہی کو پکارا ہو۔

فرط جذبات سے ہلکیں نم ہو گئیں اور اس سے  
 پہلے سامنے نظر آتے روشن دمکتے ہوئے چہرے  
 دھندلا جلتے۔ انہوں نے دونوں بازو کھول دیے۔  
 اگلے ہی پل وہ دونوں بچے ان کی آغوش میں سما  
 چکے تھے۔ جن کے لیے انہوں نے ہمیشہ ایک ہی انداز  
 سے سوچا تھا۔

”اس کا نام سکندر نخت ہے۔ دیکھنا یہ مقدّر کا  
 بھی سکندر ہو گا۔“

اماں کی سرگوشی کہیں قریب ہی سنائی دی۔  
 ”انشاء اللہ۔“ اس وقت ان کے ہونٹوں سے نکلا تھا  
 اور اب وہ کہہ رہی تھیں۔  
 ”ماشاء اللہ۔“

## ابن الشامہ کے سفرناموں کے سلسلے کا نیا سفر نامہ

## نگری نگری پھر مسافر

ابن الشامہ کے سفرناموں کے سلسلے کا آخری سفر نامہ  
 ہے جو جولائی ۱۹۸۹ء میں پہلی بار چھپ کر تیار  
 ہوا ہے اس سفرنامہ میں جاپان، روس اور لندن  
 کے سفر کا احوال درج ہے۔

یہ کتاب خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گئی ہے  
 اور مشہور کارٹونٹ ناچھی نے کارٹون بنائے ہیں

قیمت ۵۰ روپے  
 اس پتے پر خط لکھیں یا قریبی بکسٹال سے خریدیں  
 لاہور ایک ڈی ۳۰۵ - مکرورد لاہور  
 مکتبہ محمدانہ نخت، ۳۰۵، لاہور